

برف کا درد
اوپندر ناتھ اشک
S-15
1/=

زندگی کو حُسن، سلیقہ اور
نفاست بخشنے والے مُلکی و
غیر مُلکی فن کاروں کے شاہکار
برائے نام قیمت پر آپ کی خدمت
میں پیش کرتے ہیں۔

سٹار پاکٹ بُکس سیریز دہلی

ناشر

سٹار پبلیکیشنز
۲۷۶۱ - دریا گنج - دہلی ۶

(مطبوعہ :- بیری آرٹ پریس دریا گنج - دہلی)

قیمت صرف ایک روپیہ

سول ایجنٹس

پنجابی پستک بھنڈار

دریبہ کلاں دہلی ۶

ستاروں کے کھیل کے علاوہ ان کا کوئی ناول ابھی اردو میں شائع نہیں ہوا۔ حالانکہ انہوں نے ستاروں کے کھیل کے بعد ڈگری، دیواریں اور گرم راکھ جیسے مشہور زمانہ ناول لکھے جو ہندی میں شائع ہو کر مقبول ہوئے اور جن کے تراجم صوبائی زبانوں میں ہی نہیں بلکہ غیر ملکی زبانوں میں بھی چھپے۔ گزشتہ سال مرکزی حکومت کی طرف سے انہیں "بڑی بڑی آنکھیں" پہ دو ہزار کا انعام عطا ہوا۔

"برف کا درد" ان کا پانچواں اور طرزِ تحریر اور تکنیک کے لحاظ سے نہایت پختہ ناول ہے۔ اس میں انہوں نے وادیٔ کشمیر کی بے پناہ خوبصورتی اور مفلسی اور بیروزگاری، تنگ دلی اور ناخواندہ دیہاتیوں کی سادہ لوحی کی نہایت درد بھری اور طنز آمیز تصویر اتاری ہے۔ برف کا درد کی تکنیک ایک دم انوکھی ہے اس میں سیاحت اور افسانے کا کچھ عجیب سا دلچسپ امتزاج ہے۔

ناشر

مرغ نے دوسری بار اذان دی تھی جب علی الصبح حسن دین کی آنکھ کھل گئی —
آنکھ کھل گئی لیکن وہ اُٹھا نہیں، دیر تک دم سادھے پڑا رہا کہ کہیں کسی دوسرے مرغ
کسی کتے یا کسی دروازے کے کھلنے کی آواز آئے۔ پھر یہ خیال آیا کہ ابھی صبح ہونے میں
بہت دیر ہے اُس نے کمبل سے اچھی طرح بدن ڈھانپ لیا اور دوبارہ سونے کی کوشش
کرنے لگا لیکن اس کا دماغ پریشان تھا۔ دو دن سے اُسے کوئی سواری نہ ملی تھی۔ اُسے نیند
نہ آئی۔ آخر جب مرغ نے تیسری مرتبہ گلے کی پوری آواز سے گاؤں والوں کو جاگنے کا پیغام دیا
تو حسن دین اُٹھ بیٹھا۔ ابھی کانگڑی اس نے فرن کے اندر سے نکالی تو اُسے اچانک بچپن کا وہ
واقعہ یاد آگیا جب وہ پہلی بار کانگڑی لے کر سویا تھا اور اُس نے اپنا فرن جلا لیا تھا
اور وہ بُری طرح پٹا تھا۔

ملازم ہو یا کسان، گوجر ہو یا پنڈت، کشمیر میں تو اکثر بھی انتہائی افلاس میں
دن گزارتے ہیں۔ برسوں میں ایک بار عید یا نوروز کے لیے فرن سلوا پاتے ہیں۔ سوتے جاگتے
اسے پہنے رہتے ہیں۔ بغیر فرن کا ہمیں جانا پتا ہی نہیں تو اور کیا ہے —— اُس کے باپ نے
اسے پیٹا تو بُرا نہیں کیا۔ اُس نے تو اپنے بچوں کو پیٹ پیٹ کر کانگڑی کا استعمال سکھایا تھا۔
ہاتھ سے ٹٹول کر اُس نے کانگڑی کو کونے میں رکھا۔ پھر اطمینان سے سونے

ہوئے اپنے بیوی بچوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ چارپائی کے نیچے [illegible] سے باتیں ہاتھ میں لیں۔ گھاس سمیٹنے کو [illegible] اٹھا ہوا وہ کوٹھری کی طرف گیا۔ کنڈی سے کھونٹی نکال کر اس کے پٹ کھول دیئے اور باہر کے اندھیرے میں کھلتی ہوئی مدھم سی روشنی کو دیکھ کر اس نے وقت کا ٹھیک اندازہ لگایا۔

آسمان میں برا ہی گھنا جھٹ پٹا تھا، جس میں بادل گھرتے دکھائی دیتے تھے کہیں کسی نے ایک بار پھر اذان دی اور گاؤں کے پرلے کونے میں کوئی دوسرا جواں سال مرغ گلے کی پوری آواز سے اذان دے اٹھا اور نیچے اصطبل کی گزرگاہ میں سویا کرتی [illegible] باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھتے فریاد کرنے لگا کہ یا خدا! دیکھو، رات بھر کا جاگا ہوا صبح آنکھ لگی ہی تھی کہ ان موذیوں نے زمین آسمان ایک کر دیا۔ ان کم بختوں پر اپنا قہر نازل کر!

حسن دین نے کھڑکی بھیڑ دی لیکن کنڈی نہیں لگائی۔ اندر کے گہرے اندھیرے میں کھڑکی کی جھری سے ہلکی سی شفق کی وہ لکیر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مڑ کر اس نے اپنی بیوی کو جگایا کہ وہ اٹھ بیٹھے۔ جا کر لڑکے کو جگائے۔ اور وقت سے پہلے چائے تیار کر دے اس کی بیوی [illegible] کے نیچے سے [illegible] نکال کر انگڑائی لے رہی تھی۔ جب حسن دین نے باہر کا دروازہ کھولا۔ گھاس کے ڈھیر میں سے دونوں ہاتھوں میں گھاس بھر کر پیچھے [illegible] اس کوٹھری کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔

گلی کے بیچ [illegible] ایک چھوٹا سا نالہ بے آواز بہہ رہا تھا اس کے اوپر لمبے لمبے [illegible] شالی کی [illegible] تھیں، ادھر ادھر [illegible] کے بڑے بڑے [illegible] ان گھڑ دو منزلہ [illegible] احاطوں کو ہر کسان نے [illegible] کا ڈھکر ان پر [illegible] ایک دوسرے سے الگ کر رکھا تھا۔ حسن دین نے اپنے احاطے کے کونے میں گھاس [illegible] ہی پتھر کا ایک [illegible] پڑا تھا۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا اسے اسی جگہ دیکھا۔ اس نے سنا تھا کہ [illegible] کے پردادا نے اسے دو برس میں گھڑ کر تیار کیا تھا

اور اُس میں وہ اپنے گھوڑے کو دانا کھلایا کرتا تھا۔ سارے پریزپورہ بن ونیا کونڈا کہیں اور
نہ تھا۔ لیکن حسن دین کے یہاں تو اب تین گھوڑے تھے دو اُس کے اور ایک اُس کے بھائی کا
ایک کونڈے سے کیسے اُن کا کام چلتا۔ سو گھر کی عورتیں اس پر شالی پھینک کر اس سے
چاول کے دانے الگ کیا کرتی تھیں اور کبھی جب پیسے ہوتے تو موٹے ڈنڈے کی مدد سے
نمک مصالحہ تیار کر لیا کرتیں۔ نہیں وہ کونڈا حسن دین کے گھر کی پہچان کے کام آتا۔ اور
حسن دین ۔— کونڈے والا حسن دین مشہور تھا۔

کونڈے پہ پیر پیر بجاتے لمحہ بھر کے لئے حسن دین نے اپنی بوڑھی بستی کی اور اُس کے
بے ڈول مکانوں کے خاکوں پر نظر ڈالی۔ اُس نے اُڑتے سنا تھا کہ سرکار ان گھروندوں
کی جگہ اینٹ چونے کے پکے مکان بنائے گی جن میں پکے فرش ہوں گے۔ پکی سیڑھیاں
اور جن میں بجلی کی روشنی ہوگی۔ لیکن جانے یہ ہوگا بھی یا نہیں، ہوگا بھی تو نہ جانے یہ سب
دیکھنے کو وہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں؟ لیکن اُس نے یہ بھی سنا تھا کہ پہلا کام گے کسانوں
کو نوٹس ملنے والا ہے کہ مکان خالی کر دیں۔ سرکار لکڑی اور جگہ مفت دے گی۔ مکان
بنانے کو پانچ سو روپیہ قرض دے گی۔ دو میل اوپر اپنے نئے گھر بنائیں۔ سرکار ان لکڑی
کے مکانوں کی جگہ وزیروں کے لیے چھوٹے چھوٹے بنگلے بنانا چاہتی تھی اور کسان اپنے
پشتینی مکان چھوڑنا نہ چاہتے تھے ...... سرکار کے من کی بات سرکار ہی جانے۔ یا
ربّ العالمین جو سب کا ہے اور سب کے من کی بات جانتا ہے۔ حسن دین نے سوچا۔۔۔
جہاں تک ہمارا تعلق ہے اگر وزیر زیادہ آنے لگیں۔ ہمیں لگاتار کام ملے تو ہم اپنے انہی
ٹیڑھے بینگے کچے گھروں میں مست ہیں۔ مکانوں سے زیادہ ہمیں کام چاہیے۔ کام اور
روٹی ۔۔۔!'

وہ چاہتا تو تھا کہ ... نئے پکے مکانوں کا تصور
کرے۔ پر اُس کے پاس تخیل یا تجسس ... تھا۔ نہ وقت تھا اور نہ دماغ ۔۔۔

اُسے تو بس اڈّے پر وقت سے پہنچنے کا احساس تھا۔

اُس کی بیوی اُس کے پیچھے پیچھے اُسی کی طرح باہوں میں گھاس بھرے اُٹھائی تھی۔

"یا اللہ" — حسن دین نے لمبی سانس بھرتے ہوئے اُس غائبانہ طاقت کو پکارا جس پر اپنے سب بھلے بُرے کی ذمہ داری ڈال کر وہ مطمئن ہو جاتا تھا۔

گھاس کی بو پا کر اندر اصطبل میں گھوڑے ہنہنائے۔ "داوا زد ارک وار!!"

سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اُس نے انھیں صبر کی تلقین کی۔ پھر وہ اور گھاس لانے اوپر چلا گیا۔ اُس کی بیوی اوپر نہیں گئی — اُس نے اصطبل کے ایک کونے میں پڑے ممدو کو جگایا — وہ دُور کے رشتے میں اس کا چچیرا بھائی تھا۔ اُس کی نہ زمین تھی نہ جائداد۔ اور وہ ان کے گھوڑوں کی رکھوالی کرتا تھا اور دو ٹکڑے کھا کر وہیں پڑا رہتا تھا۔

حسن کی بیوی مشکل سے پچیس تیس سال کی ہوگی۔ گورا رنگ۔ ستواں ناک اور تیکھے نقش اور پیارا پیارا سا نام یاسمین۔ لیکن کشمیر کی بیشتر عورتوں کی طرح اُس کی چھاتیاں ڈھلک گئی تھیں۔ محنت، مشقت، بھوک اور میل نے اُسے ادھیڑ بنا دیا تھا۔ ممدو کی مدد سے گھوڑے باہر کرکے وہ اصطبل صاف کرنے لگی۔ حسن دین اس دوران میں دو تین بار گھاس لے آیا تھا۔

گھوڑے گھاس میں مُنہ مارنے لگے اور اُس کی بیوی اصطبل صاف کرکے اوپر چلی گئی تو حسن دین اپنے احاطے کے بیچ کواڑ پھاٹک میں آ کھڑا ہوا۔ جون کا مہینہ ختم ہونے کو آ گیا تھا اور ہوا میں اگرچہ ٹھنڈک تھی لیکن اُس کی دھار کُند ہو گئی تھی۔ پھاٹک میں کھڑے کھڑے اور نالے کے سرسراتے پانی کو دیکھتے ہوئے حسن دین کے جی میں آئی کہ وہ نالے کے پانی میں وضو کرکے فجر کی نماز پڑھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ خدائی ہستی میں پختہ اعتقاد رکھتے ہوئے بھی وہ نماز روزے اور صوم و صلوٰۃ کا اتنا پابند نہ تھا۔ کڑی مشقت نے اسے اس بات کا موقع

ہی نہ دیا تھا کہ وہ پانچ بار نماز پڑھے ...... خدا نے دو جہاں سب کے دل کی بات جانتا ہے۔ سب کی مصیبت کو سمجھتا ہے تو کیا اُسے نہیں معلوم کہ حسن دین کئی بار تو اسے تڑکے اُٹھ کر چل پڑتا ہے دن وہ پینجر دن کو بسر کر ایا کرتا ہے اور رات پڑے ہی گھر آ پاتا ہے اُسے یقین تھا کہ خدا اُس کی تکلیف کو خوب سمجھتا ہے۔ اور اسی لئے وہ سوتے وقت کچھ پڑھ کر اور دعا مانگ کر ہی صبر کر لیتا تھا

لیکن ہوا میں کچھ عجیب سی تازگی تھی نالے کے پانی میں ایک عجیب سا پیغام تھا۔ وہ بہت تڑکے اُٹھ گیا تھا۔ اُس کے پاس وقت بھی کافی تھا تو کیوں نہ وہ آج فجر کی نماز پڑھنے کا ثواب حاصل کرے۔

یہ خیال آتے ہی اُس نے عمار کو جلدی سے تیار ہونے کی ہدایت کی اور حوائج ضروری سے فارغ ہونے باہر کھیتوں میں نکل گیا۔ واپس آکر اس نے نالے کے پانی میں پہلے ہاتھ دھوئے پھر لوٹے میں پانی بھر کر اُسے تین بار سونگھا پھر تین بار کلا کیا۔ پھر تین بار منہ دھویا۔ پھر تین بار کہنیوں تک ہاتھ دھوئے۔ پھر چلو میں پانی بھر بھر کے گیلے ہاتھوں کو منہ، ناک، ماتھے کے اوپر سے بالوں پر لے جاتا اور کانوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے مسح کیا۔ پھر تین تین بار دائیں بائیں پیر دھوئے اور یوں حسب قاعدہ وضو کر کے (اُس کی برسوں کی جمی میل تو کیا اُترتی، ہاں رسم پوری ہو گئی) اس نے وہ کمبل جو وہ گلے سے لپٹا تھا۔ زمین پر بچھایا اور فجر کی نماز پڑھنے لگا۔

رات کی سیاہی میں کچھ اور سفیدی مل گئی تھی۔ بادلوں میں سے جو آسمان جھانک رہا تھا۔ اس جھٹپٹے میں پریتی پورہ کے گوجروں کے باکڑی کے مکان عجیب سے اُداس اُداس لگ رہے تھے۔ سردیوں میں جب گاؤں کے مکانوں کی کچی منزلیں برف سے ڈھک جاتی ہوں گی اور شالی کی کوٹھیوں کے لمبے لمبے پائے برف میں دب جاتے ہوں گے تو شاید وہ اچھی لگتی ہوں لیکن اس وقت تو اپنے لمبے لمبے برہنہ پایوں پر کھڑی لکڑی کے

بڑے بڑے صندوقوں سی وہ کوٹھیاں اُس اُداسی کو اور بھی گہرا بنا رہی تھیں۔ دو چار کتے اپنی پناہ گاہوں سے نکل آئے تھے اور بے چین روحوں کی مانند بھٹک رہے تھے۔

رات بھر چراگاہ میں گھاس چرتے رہنے والے گھوڑے، اگلی رانوں، ٹانگیں بندھی ہونے کے باعث پھدک کر پچھلے پاؤں رکھتے واپس آ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ گاؤں جاگ رہا تھا۔ لیکن حسن دین سب طرف سے بے پرواہ خدا کی عبادت میں مگن تھا۔ نماز پڑھ کر اُس نے دونوں پھیلا کر دُعا مانگی کہ اے پروردگار میں تیرا غریب بندہ ہوں گنہگار ہوں، میں بے کار ہوں۔ لیکن تو غریب نواز ہے بخشنے والا ہے اور کارساز ہے۔ کئی دنوں سے مجھے کوئی سواری نہیں ملی۔ کچھ ایسا کر کہ میرے تینوں گھوڑے لگ جائیں۔ مجھے اچھی تگڑی سواریاں ملیں جو گلمرگ ہی نہیں کھلن مرگ اور دو نالے تک جائیں اور میری پچھلے دنوں کی کسر نکل جائے

خدا نے شاید اُس کی دُعا سُن لی تھی۔ کیونکہ جب وہ ممدو اور عبید کے ساتھ ٹنگمرگ کے اڈے پر پہنچا تو اُس نے دور ہی سے دیکھا کہ نہ رشید ہے نہ کریم خاں بلکہ سردار ہرنام سنگھ دلالی کرانے [illegible] اڈے کا ٹھیکہ لئے ڈیوٹی بجا رہے ہیں۔ نماز کی مشغولیت میں خواہ وہ اس بات کو بھول گیا۔ لیکن اُس کے بعد تھیلے سے پنیر کو نمکین چائے کی مدد سے حلق کے نیچے اتارتے ہوئے، گھوڑوں کی زین کسنے اور ٹنگمرگ کے اڈے کی طرف گھوڑے دوڑاتے وقت لگاتار اسے اس بات کی فکر ستاتی رہی کہ کہیں پچھلے تین دنوں کی طرح کریم خاں یا رشید صوفی کی ڈیوٹی نہ ہو۔ اور وہ بار بار یہی مناتا رہا کہ یا خدا! آج ہرنام سنگھ کو ڈیوٹی پر بھیج دے۔

"سلام حضور ـــ" دُور ہی سے ہرنام سنگھ کو دیکھ کر دانت نکوستے ہوئے وہ قدرے جُھک گیا۔

"سُنائیے ۔ آگیا مورچے پر ـــ !!" حضور نے اپنی کھُدری کھُدری داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ہرنام سنگھ درمیانی قد، پتلا چھریرا سکھ تھا۔ کشمیری سکھوں کے چہرے پر اُن کے بالوں میں جو مکئی کے کچے بھٹوں کا سا سفیدی مائل سنہرا پن ہوتا ہے اُس کا ہرنام سنگھ کے ہاں نشان تک نہ تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ ہی نہیں بالوں کا رنگ بھی کالا سیاہ تھا۔ داڑھی اُس کی نہ مُنڈا سے بندھی تھی نہ ڈورے سے کسی تھی اور اسکے قد ہی کی طرح چھوٹی تھی۔ اُس کے گہرے دھنسے گالوں، اور چوڑے جبڑوں پر اُس کی داڑھی کے یہ ان بندھے، چھوٹے کھُدرے کھُردرے، کالے بال اُس کے چہرے کو کچھ عجیب سا روکھا بنا رہے تھے ـــ "سُنائیے ۔ آگیا مورچے پر!" کہتے ہوئے وہ اگرچہ کچھ ہنسا بھی تھا۔ اور اپنی طرف سے اُس نے حسن دین سے مذاق کیا تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس پر کوئی الزام لگا رہا ہو۔

حسن دین نے سردار ہرنام سنگھ کے مذاق کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑی بے بس اور خوشامد بھری ہنسی ہونٹوں پر لا کر وہ اڈے پر گھوڑے باندھنے لگا۔!

وہ پربزپور کا چھوٹا سا کسان تھا۔ تھوڑی سی زمین اور لکڑی کے اس ان گھڑ ٹیڑھے میڑھے مکان کی زمین کو ٹھکریاں۔ یہی اُس کی کل جائیداد تھی۔ اگرچہ اُس کی عمر چالیس پینتالیس کی تھی۔ لیکن سخت محنت اور آدھے پیٹ کھانے نے وقت سے پہلے اس کے چہرے پر لکیریں بنا دی تھیں۔ درمیانہ قد، کھچڑی داڑھی مونچھیں۔ میلے کشمیری فرن میں ڈھکا ہوا جسم، گہرے دھنسے گال، اُبھرے جبڑے، پیلے دانت ..... گھوڑے باندھتے ہوئے اُس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ ہرنام سنگھ سے اس کی بات کٹی وہ ٹھیکیدار کو اس کا کمیشن دے نہ دے ـــ مگر ہرنام سنگھ کو اس کا حصہ

ضرور دیتا تھا، اور ہر نام سنگھ چاہے دو ایک ڈنڈے اُس کو رسید کر دے لیکن سب سے اچھی یا امیر سواری کو اُس کے گھوڑے دلوا دیتا تھا۔

حاکم کو سلام کر کے، وہ اڈّے کے دونوں ہوٹلوں کے مالکوں کو سلام اور بیروں، خانساموں، بہشتیوں سے ملاقات کرآیا۔ کیونکہ کئی بار سواری کا من بنانے میں وہ لوگ بڑی مدد کرتے ہیں۔ ان سب سے نپٹ، گلے میں لپٹا ہوا کمبل زمین پر بچھا کر وہ اڈّے کی ڈھلان پر دھوپ میں لیٹ گیا۔

اُسے لیٹے ہوئے ابھی کچھ ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ دُور سے بس آتی دکھائی دی۔

حسن دین نے اُچک کر دیکھا ۔۔ پرائیویٹ بس تھی۔ اُس کے ساتھی ایکدم اُٹھے، قلی منتی ہو گئے۔ لیکن حسن دین پھر بیٹھ گیا۔ پرائیویٹ بسوں میں زیادہ تر وہ لوگ آتے تھے۔ جو سرکاری بس کرائے میں سے بھی کچھ بچانا چاہتے تھے جن کو آرام کے مقابلے میں دام زیادہ پیارے ہوتے۔ ان میں سے بیشتر وزیر بستر قلیوں کو دے کر خود پیدل چلنا پسند کرتے تھے۔ حسن دین اپنی آنکھ ہمیشہ سرکاری بس پر رکھتا تھا۔

لیکن سرکاری بس بھی پرائیویٹ بس کے پیچھے پہنچی۔ اور اڈّے پر ہلچل مچ گئی ایک ایک بستر سے تین تین قلی لپٹ گئے ۔۔ مسافروں کی جیبیں نمبروں سے بھر گئیں۔ بسوں سے سامان اُتارنا مشکل ہو گیا۔

سامان اُترا تو گھوڑے والے بڑھے۔ کچھ غریب جو صرف ٹھیکے پر گھوڑا چلاتے تھے قلیوں میں مل گئے۔ حسن دین پیچھے کھڑا مسافروں کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کا ماتھا سکڑ گیا۔ آنکھیں عقاب کی سی تیز ہو گئیں۔ لیکن اتنے قلی بسوں کو گھیرے کھڑے تھے کہ کچھ بھی جاننا مشکل تھا۔ ۔۔ پھٹی قمیض یا میلے فرن پہنے، برسوں سے نہائے ننگے پاؤں گھٹنوں تک پاجامے چڑھائے ۔۔ ہڈی کے ایک ٹکڑے کے لئے ایک دوسرے

کو نوچ ڈالنے والے کتوں کی طرح آپس ہی گتھے جاتے تھے۔ اُسی وقت سردار ہرنام سنگھ سپاہیانہ گالیاں دیتے ہوئے، چھوٹے قد کی وجہ سے ڈنڈا سر کے اُوپر اُٹھائے ان میں گھس پڑے۔ پھر جیسے ان کا ڈنڈا، گوشت پوست کے انسانوں پر نہیں، مٹی کے لوندوں پر پڑ رہا ہو ـــ انہوں نے جو سامنے پڑا اس پر برسا دیا۔

پل بھر میں سب قلی تتر بتر ہو گئے۔ صرف وہی لوگ رہ گئے جنہیں ہرنام سنگھ چاہتے تھے کہ وہاں رہیں یا جو دو چار آنوں کے مقابلے میں دو چار ڈنڈوں کی کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ تبھی حسن دین دوسرے ساتھیوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ اُس کی نظر ایک سیٹھ پر پڑی۔ تیس پینتیس برس کی عمر۔ دوہرا گورا جسم، چوڑا ماتھا مکھن سے گورے اور پکے سے پھولے گال، سلک کی قمیض اور کار مُنے کی پلینٹ، بانہہ پر گرم کوٹ ـــ ہرنام سنگھ سے وہ گلمرگ، اور کھلن مرگ کا کرایہ پوچھ رہے تھے۔ ان کی بیوی اور دس گیارہ سال کا لڑکا ذرا دور سامان کے پاس کھڑے تھے۔ کھلن مرگ...... حسن دین چوکنا ہو گیا...... ہرنام سنگھ سے آنکھیں ملتے ہی اُس نے دانت نکوس دیئے۔

سیٹھ کہہ رہے تھے ـــ "ہمیں اصیل گھوڑے چاہئیں سردار جی! ہم میں سے کوئی گھوڑا چلانا نہیں جانتا ـــ!"

"آپ چلیئے، چائے پیجئے۔!! گھوڑے میں بھجواتا ہوں۔ وقت ملا تو خود لے کر آؤں گا۔"

ہوٹل کا گائیڈ اتنی دیر سے سیٹھ جی کے انتظار میں کھڑا تھا...... سیٹھ جی اسکے پیچھے پیچھے چلے تو حسن دین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہرنام سنگھ کو اشارہ کیا کہ ابھی آتا ہوں، ذرا ان سے بات کر آؤں۔ اور وہ قدرے فاصلہ پر اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

ہوٹل کے پچھلی طرف چھوٹا سا گھاس کا میدان تھا۔ جہاں سے فیروزپور کے نالے اور اس کے عقب میں پہاڑوں کا انتہائی حسین منظر دکھائی دیتا تھا — وہاں تپائیاں اور کرسی لگی تھیں اور مسافر وہاں چائے بھی پیتے تھے اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔ سیٹھ اپنی بیوی بچے کے ساتھ وہاں ایک میز پر بیٹھ گئے بیرے کو انہوں نے چائے اور توس لانے کا حکم دیا۔

حسن دین ادھر برآمدے میں ہی رک گیا اور چپ چاپ مزے لینے لگا

تبھی سیٹھ کی بیوی نے کہا — "جتنے میں چائے آتی ہے ایک پوز لیجئے نا"

اور لڑکا چہکا — "ہاں ہاں —! باپوجی !! (وہ اپنے باپ کو پیار سے باپوجی کہتا تھا —) فوٹو لیجئے —" اور کرسی سے اٹھ کر مسرت سے اس نے گھاس پر ایک قلابازی لگائی۔۔

"ضرور — ضرور —!!" کہتے ہوئے کھنہ صاحب (یہی سلک کی قمیض اور کاٹھ رائے کی پتلون والے سیٹھ کا نام تھا۔) اٹھے۔

اور حسن دین نے دیکھا کہ کھنہ صاحب نے اپنے چمڑے کے چھوٹے سے بکس سے جو ان کے کندھے سے لٹک رہا تھا ایک چھوٹا سا خوبصورت کیمرہ نکالا — کھٹکا دبا کر اسے کھولا۔ وہ چھوٹا سا کیمرہ دیکھتے دیکھتے بڑا بن گیا — پھر انہوں نے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا تین ٹانگوں والا سٹینڈ نکالا اور باری باری اس کی تینوں ٹانگیں کھینچ کر اسے کتنا ہی بڑا بنا دیا۔ کیمرہ کو سٹینڈ پر فٹ کر کے انہوں نے اس پر ایک کالا کپڑا ڈالا۔

حسن دین نے برسوں پہلے، جب کشمیر میں انگریزوں کا دخل تھا، گلمرگ کے نیڈو ہوٹل میں کیمرے والوں کو ایسے ہی انگریز عورت مردوں کے فوٹو لیتے دیکھا تھا۔ ضرور آج یہ بڑی (پیسے والی) سواری ہے۔ اُس نے دل میں سوچا اور وہ شب بلڈنگ کی طرف بھاگا جہاں سردار سہز نام سنگھ ابھی تک اس کو ڈانٹتے اُس کو پھٹکارتے اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے۔

کھنہ صاحب نے کیمرہ فٹ کر کے پہلے دو ایک تصویریں فیروز پور کے نالے اور اُس کی گھاٹی کی لیں۔ اتنے میں چائے آ گئی۔ میز پر لگ گئی ـــ تب اور فوٹو انہوں نے اپنی بیوی اور بچے کے (چائے پیتے وقت کے) لئے۔۔۔ ایک ماہر فوٹو گرافر کی طرح انہوں نے بچے کے ہاتھ میں بسکٹ اور بیوی کے ہاتھ میں چائے کا پیالہ دے دیا تاکہ پوز بالکل نیچرل معلوم ہو۔

دوسرا پوز لیتے وقت وہ کیمرہ کے بیلو پر ایک کپڑا ٹھیک کر رہے تھے کہ اُسی بس سے اُترنے والے ایک ساتھی نے پوچھا۔ "آپ کیا فوٹو گرافر ہیں۔"

"جی نہیں! ـــ میری تو دراصل چھوٹی سی کپڑے کی دوکان ہے چاندنی چوک میں"

کھنہ صاحب فوٹو لیتے ہوئے رک کر بولے

"لیکن کیمرہ تو آپ کا ۔۔"

"جی بالکل معمولی ہے۔۔۔۔ــ ۶ براؤن"

"لیکن کالا کپڑا تو آپ۔۔۔۔!"

"جی بہت دن پہلے یہ کیمرہ ایک دوست سے خریدا تھا۔ بیکار پڑے پڑے اس کا بیلو خراب ہو گیا۔۔۔۔۔!"

"کیا ہوا اسے۔۔۔؟"

"اکپڑے میں سوراخ ہو گئے تھے اور روشنی فلم پر پڑنے لگی تھی۔ ہم کشمیر کی سیر کو آئے تو ان سے کیمرہ مانگ لائے۔ خیال تھا "شملا اسٹوڈیو" میں اِسے ٹھیک کرالیں گے لیکن کچھ ایسے ضروری کام آ پڑے اور کچھ ایسی افراتفری میں چلے کہ اسے ٹھیک کرانے کی یاد نہیں رہی۔ سری نگر میں "منٹھا" سے پوچھا تو اس نے کہا۔ اِسے ٹھیک کرنے میں تین چار دن لگ جائیں گے۔ آپ ابھی کالا کپڑا رکھ کر کام چلایئے۔ گلمرگ سے لوٹیے گا تو ہم ٹھیک کر دیں گے۔ یہ کپڑا ابھی انہوں نے دیا ہے۔"

اور ہنس کر کھنہ صاحب پھر فوٹو لینے میں منہمک ہو گئے۔ دو تصویریں اپنی بیوی اور بچے کی لے کر، انہوں نے ایک تصویر ایسی لی کہ وہ کیمرے کی لوکیشن اور فوکس ٹھیک کر کے خود اپنی بیوی کی جگہ بیٹھ گئے اور انہوں نے ایک توس منہ میں لے لیا اور اُن کی بیوی نے جا کر کیمرے کا بٹن دبا دیا۔

ناشتہ کر کے وہ لوگ تیار تھے کہ حسن دین سردار ہرنام سنگھ کو لیے ہوئے وہاں آ پہنچا۔ لیکن معلوم یہی ہوتا تھا جیسے ہرنام سنگھ خود اُسے لے کر آ رہے ہوں۔ حسن دین کے پیچھے مہروا اور اس کا بیٹا عیدا اپنے اپنے گھوڑوں کی لگامیں تھامے چلے آ رہے تھے۔

"یہ لیجئے، آپ کے لئے اچھے گھوڑے لایا ہوں۔" ہرنام سنگھ نے کہا۔ "آدمی معتبر ہے۔ آپ نے ہم پر چھوڑ دیا تو ہم نے پچاس گھوڑوں میں سے یہ تین خود چُنے۔ ایسے شرارتی اور شوخ گھوڑے ہیں اس اڈے پر کہ انجان سواری کو گرا دیتے ہیں۔ لیکن جو گھوڑے میں لایا ہوں، ان پر بچّہ بھی بیٹھ کر اطمینان سے چلا جا سکتا ہے۔"

کھنہ صاحب نے ہرنام سنگھ کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "سبھی پولیس والے اگر اس طرح تعاون کریں تو مسافروں کو بڑی آسانی ہو جائے۔"

"دیکھئے یہ ـــ ان کو تنگ نہ کرنا۔ اور ہرنام سے سب کچھ دکھا لانا۔" حسن دین کو ڈانٹ کر اور کھنہ صاحب کو "جے ہند" کہہ کر سردار ہرنام سنگھ چلے گئے تو کھنہ صاحب نے

گھوڑے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

"دیکھو فکر نہیں ہے صاب —! دیکھیے صاب —!!" کہتے ہوئے حسن دین نے بڑی مستعدی سے گھوڑا کھنہ صاحب کے سامنے لا کھڑا کیا اور ایک طرف سے کاٹھی تھام کر اُس نے انھیں چڑھنے میں امداد بھی دی۔

"صاب۔ ایک دم اصیل گھوڑا ہے۔ سوار گرائے گا نہیں — لگام کو ڈھیلا چھوڑا گیا تو سیدھا الپتھر تک لے جائے گا۔"

کھنہ صاحب مطمئن ہو گئے۔ پھر انہوں نے باقی گھوڑے دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

"یہ سامان کیسے جائے گا —؟" گھوڑے سے اُتر کر انہوں نے حسن دین سے پوچھا۔

"قلی لے جائے گا۔ بارہ آنے ریٹ ہے صاب۔ بپاری سے پوچھ سکتے ہیں صاب —!"

کھنہ صاحب کے پاس دو بستروں کے علاوہ ایک اٹیچی اور ایک تھیلا تھا — ان کا خیال تھا کہ یہ سارا سامان ایک قلی اُٹھا کر لے جائے گا۔ لیکن جب دو بستر دو قلیوں نے باندھ لئے اور تیسرا قلی اپنے کمبل میں اٹیچی اور تھیلا باندھ کر بیٹھ رہا اور چلنے کو تیار ہوا تو کھنہ صاحب اُسے روک کر ہانپتے ہوئے پھر ہرنام سنگھ کے پاس پہنچے، اور انہوں نے قلیوں کی شکایت کی کہ وہ بستر کے علاوہ کچھ اور اُٹھانے کو تیار نہیں۔

تب ہرنام سنگھ نے انہیں سمجھایا کہ ٹنگمرگ سے گلمرگ کا راستہ بڑا چڑھائی کا ہے بستر بھاری ہیں۔ قلی نہیں اُٹھا سکتے، اٹیچی اور بیگ اگر چھوٹے ہیں تو انہیں سائیسوں کو دے دیجئے۔ قلی کو آپ بارہ آنے دیں گے۔ انہیں دو دو چار چار آنے اوپر سے دے دیجئے گا۔ —!"

واپس آکر کھنہ صاحب نے سردار ہزنام سنگھ کے مشورے کیمطابق تلیسیے قلی سامان اُٹھوا لیا۔ اور حسن دین سے کہا کہ اٹیچی وہ اُٹھائے اور کینڈس کا بیگ اُس کا لڑکا اٹھائے گا اُنہیں کچھ بخششیں مل جائیں گی۔

ملاو میم صاحب کو بیگ پڑھ گیا تھا۔ عبدو ابھی چھوٹا تھا۔ لیکن حسن دین نے کہا۔ "کچھ فکر نہیں صاحب۔!" اور گلے سے لپٹا ہوا کمبل دھرتی پر بچھا کر اس میں اٹیچی باندھ کر اُس نے کندھے پر رکھا۔ اُس کے لڑکے نے بیگ اُٹھا لیا۔ قلی اس دوران میں بستر نے شمارٹ کٹ (چھوٹے پیدل راستے) کی جانب چڑھ گئے تھے۔ کھنہ صاحب حسن دین کی مادے گھوڑے پر چڑھے اور اپنی بیوی اور بچے کے پیچھے گلمرگ کی سڑک پر بڑھ چلے۔

کچھ دور چل کر حسن دین نے دیکھا کہ اُس کے لڑکے کو بیگ اُٹھانے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ تب بیگ اُس سے لیکر اُس نے اپنا کمبل کھولا اور بیگ کو اٹیچی کیس پر رکھ کر اس نے کمبل کو کچھ اس طرح سے باندھ لیا جیسے پہاڑی اور تبتی عورتیں مرد بچوں کو پیٹھ سے باندھ لیتے ہیں۔

جب وہ پھر چلنے لگا تو اس کی کمر جھکی گئی اور اس پر ایک بڑا سا کوہان بنا تھا۔

ٹنگمرگ سے گلمرگ کی چڑھائی ہے۔ لیکن لمحہ بہ لمحہ اونچی ہوتی سڑک پر چڑھتے بڑھتے حسن دین نے کچھ ایسا سا (؟) کہ اُس نے اس ناچیز کو دُعا قبول کر لی اور اُسے اُس کی من پسند سواریاں دلا دیں۔

کھنہ صاحب اپنے گھوڑے کے پیچھے ہو کر بیگ اُٹھائے اور گھوڑے کے بارگے

یہ بے ساختہ "دار، دار، دار، دار" پکارا اٹھے ہوئے حسن دین نے حساب لگایا کہ اگر یہ سواریاں سچ مچ کھلن مرگ تک جائیں اور سرکاری ریٹ بھی آ سے ملے تو فی جانے کے سترہ اٹھارہ روپے ہوتے ہیں۔ پھر وہ اُن کا سامان بھی ساتھ اٹھا کر لے جائے گا اور ہر طرح اُن کی خدمت کرے گا۔ یہ لوگ شکل وصورت اور لباس سے خاصے دولتمند معلوم ہوتے ہیں۔ پانچ روپے بخشش نہ دے گا تو دو تین دے گا ہی۔ اور اگر وہ انھیں بابا رشی لے جانے میں کامیاب ہو گیا تو سات دس روپے کی اور آمدنی ہو جائے گی پھر کھلن مرگ اور دو نالے تک جا کر سیٹھ نے الپتھر یا وہ ون ٹریک دیکھنا چاہی تو وہ گاہک کی شکل ہی ساتھ دیا جائے گا...... اور ایک روپیہ بخشش ضرور ملے گا۔ چائے اور کھانے کے پیسے الگ......

میم صاحب اور بچہ کافی آگے چلے گئے تھے۔ حسن دین نے قدم بڑھا کر ٹٹکاری بھری۔ گھوڑے نے تیز قدم بڑھائے۔ کچھ دیر تک وہ گھوڑے کے ساتھ تیز تیز چلتا رہا۔ پھر جب وہ دوسرے گھوڑوں کے برابر آگئے تو پھر وہ اپنے خیالات میں محو ہو گیا۔

...... اُس کے سامنے گذشتہ کئی برسوں کی تصویریں گھوم گئیں۔ ہندوستان یا پاکستان کو آزادی ملی ہو لیکن کشمیر کے کاروبار کا تو اس آزادی نے ستیاناس کر دیا یہاں اتنی کھیتی تو ہوتی نہیں کہ عوام کا پیٹ اُس سے بھر جائے۔ پھر کسان اپنے کھیتوں سے پیٹ بھرنے کو کچھ پیدا بھی کر لیں تو زندگی کی باقی ضرورتوں کے لئے پیسہ کہاں سے آئے۔ کشمیر کا بڑا دھندا ہمیشہ سے وزیٹروں کا آنا رہا ہے۔ ہانگی گبرو یا کاریگر، کسان ہوں یا مزدور ——— اسی دھندے کے بل پر اپنی ضروریات پوری کرتے رہتے ہیں اور اس آزادی نے جس چیز پر سب سے زیادہ چوٹ کی تھی وہ یہی دھندا تھا پہلے وحشی قبائلی لوٹ مار مچاتے بڑھے آتے تھے ——— شور مچاتے برساتی ندی کی طرح گاؤں

بستیاں اُجاڑتے ـــــ پھر جب وہ بڑھے تو کشمیر پیچھے رہ گیا۔ ندی کا زور گھٹ
جانے پر کیچڑ سی دلدلی مٹی جیسا ـ جس میں مچھلیاں بھوک اور پیاس سے جھٹپٹاتی تھیں
ــــ ہاں کچھ گڑھوں میں پانی ضرور بھر گیا تھا اور وہاں مچھلیاں تو مزے کر رہی تھیں
ہندوستانی ملٹری آ گئی تھی ۔ اس کا مالی فائدہ بھی تھا ــــ لیکن انھیں گاؤں یا شہر تو
ہیں جہاں اُن کی چھاؤنیاں تھیں ۔ وزیٹروں کی جگہ تو ملٹری لے نہیں سکتی۔ حسن دین
کے اپنے گاؤں پہ تو بھاری مصیبت آ پڑی تھی دو وقت کا نہ سہی ۔ ایک وقت کا سہی ــــ
روکھا سوکھا کھانے کو تو مل جاتا تھا ۔ لیکن باقی کام دھرے کے دھرے رہ جاتے تھے
اُس کی بوڑھی ماں کی بڑی حسرت تھی کہ بابا پام دین کے حضور میں اپنے پوتے
پوتی کی شادی کے بارے میں اُس نے جو منّت مانی تھی وہ اپنی آنکھوں کے سامنے پوری کرے
لیکن روٹی کے تو لالے پڑ گئے تھے۔ شادی بیاہ کی کون کہے۔

حسن دین کے سامنے وہ دن گھوم گیا جب دس گیارہ سال پہلے عیدو کو لے کر
وہ سب "بابا پم رشی" کے مندر میں گئے تھے ـــــ بات یہ ہوئی کہ اگرچہ اُس کی شادی
کو پانچ سال گزر گئے تھے لیکن اُس کے گھر اولاد نہ ہوتی تھی ـــــ تب اس کی ماں ان
کو بابا رشی کے مزار پر لے گئی تھی وہاں زیارت گاہ کی کھڑکی سے اُس کی بیوی نے
اپنی چوٹی سے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر باندھی تھی اور منّت مانی تھی کہ اگر " بابا م رشی"
اس کی گود بیٹے سے بھر دیں گے تو وہ اپنے پہلوٹھی کے بچے کو زیارت کی نذر کرے گی ـــ
دوسرے سال ہی اُس کے گھر عیدو نے جنم لیا تھا ۔ اُس کی اماں چاہتی تھی کہ منّت
کے مطابق پہلا بچہ بابا پام دین کی خدمت میں دے دیا جائے لیکن نہ اُس کی بیوی راضی ہوئی
اور نہ وہ خود ۔ ۔ ۔ ۔ عیدو اتنا خوبصورت نازک اندام بچہ تھا کہ وہ کسی طرح بھی اُسے زیارت
گاہ کی خدمت میں دینے کو تیار نہ ہوئے ۔ ماں نے بابا رشی کے قہر و غضب کا خوف دلایا ۔ تو وہ
دونوں مجاوروں کی خدمت میں جا حاضر ہوئے ۔ جب حضرت ابراہیم کے لڑکے کی جگہ قربانی سے

دنبہ بھیجدیا اور اس کی قربانی قبول کرلی تو گیا "بابا رشی" اُن کے بیٹے کی جگہ، دوسری قربانی نہ قبول کریں گے۔ ہ جب مجاور نے بتایا کہ زیارت گاہ میں اس کا انتظام ہے اور اس کے صلاح مشورے سے انہوں نے بچے کے سر پر بالوں کی ایک لٹ چھوڑ دی۔ مجاور نے کہا کہ اُسے اس وقت تک نہ چھوڑا جائے۔ جب تک "بابام رشی" کی منت نہ پوری کردی جائے۔ کیونکہ لڑکا وہ اب وہاں دینا نہیں چاہتے اس لئے وہ ایک دُنبے کی قربانی دیں اور سو روپے خیرات میں بانٹیں۔

اور جب عیدو تین سال کا ہوگیا تھا تو اماں ان سب کو لیکر "بابام رشی" کے مزار پر گئی تھی۔ حسن دین کی آنکھوں کے سامنے وہ سارا منظر گھوم گیا۔۔۔۔۔ اندر مزار کے سامنے حجام نے عیدو کے سر کی وہ لٹ باقاعدہ اپنے استرے سے کاٹ کر "بابا رشی" کے قدموں پر چڑھائی تھی۔ اور حسن دین نے سو روپے کی نذر اُتاری تھی۔ پھر موٹے تازے دُنبے کی قربانی دے کر دیگ چڑھادی گئی تھی۔ اُس کے گرد گھیرا ڈال کر عورتوں نے بابا یام رشی کی تعریف و توصیف میں گیت گاتے ہوئے بڑے بڑے نان پکائے تھے۔ اور سب کو دعوت دی گئی تھی۔ مجاور نے اُس سو روپوں میں سے پچاس روپے رکھ لئے تھے اور باقی غریب غرباء میں تقسیم کردیئے تھے۔

حسن دین کا تین سو روپیہ اُٹھ گیا تھا۔ لیکن وہ زمانہ ہی اور تھا۔ انگریزوں کی حکومت تھی اور ٹکمرگ اُن کی جنت تھی۔ ہر سیزن میں وہ چار یا پانچ سو روپے بچا لیتے تھے۔ سردیوں کے اخراجات کے لئے روپے الگ کرکے، ہر سال اُس نے سو روپے زمین میں گاڑ رکھے تھے اور تین سال بعد بڑے دھوم دھڑاکے سے بابا یام دین کی منت پوری کردی تھی۔

اس کی اماں نے اُس دن مزار کی جھلملی سے تاگا باندھ کر دعا مانگی تھی کہ اگر اُس کے بڑے لڑکے کے گھر ایک لڑکی ہو تو وہ دونوں کا نکاح "بابا رشی" کے حضور میں آکر کرے گی۔ "بابا رشی" کی مہربانی سے اگلے ہی سال اس کے بڑے بھائی کے گھر ایک لڑکی

ہوئی ـــ پیدا ہوتے ہی اُس کی اور عیدو کی سگائی کر دی گئی۔ لیکن شادی کی نوبت آج تک نہ آئی تھی۔ اماں تو چاہتی تھی کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پوتے پوتی کی شادی ہو جائے۔ لیکن ایک سال بعد ہی ہندوستان آزاد ہو گیا۔ اور یہ قہر ٹوٹ پڑا۔

اماں کا کہنا تھا کہ اُس کی بیوی نے اپنا پہلوٹی کا بچہ "بابا رشی" کی خدمت میں نہ دے کر بڑا بھاری گناہ کیا ہے۔ اس لئے پھر اُس کی گود نہیں بھری اور اسی گناہ کی وجہ سے کشمیر پر یہ آفت ٹوٹی ـــ انہیں روٹی کے لالے پڑ گئے اور اُس کے پوتے پوتی کی شادی رک گئی۔

ایک غریبی دوسرے برخورداری ـــ ! ایک تو تنگی کا زمانہ دوسرے اماں کے روز روز کے طعنے۔ حسن دین کھلا گیا "بابا ناراض ہو گئے تو اس سال کیا کیوں نہیں ٹوٹی۔ ۹ سال بعد کیوں ٹوٹی۔ ؟" وہ ایک دن چلّا اُٹھا تھا ...... "تم جاہل عورت، تمہیں اس کی کیا سمجھ ہے۔ شیر کشمیر کا لیکچر سنو تو تمہیں معلوم ہو کہ یہ آفت کیوں ٹوٹی۔ ؟"

اگرچہ اُسے الف سے ب نہ آتی تھی۔ لیکن انگریزوں کو گلمرگ، کھلن مرگ، الپتھر، سا نتارنگ، تو سے میدان، اور دوسری جگہوں میں گھمانے پھرانے وہ چند انگریزی کے الفاظ بولنے لگا تھا اور ماں کو ان پڑھ جاہل سمجھتا تھا۔ لیکن ماں کو ڈانٹنے کے باوجود اُس کے دل میں خوف تھا کہ "بابا رشی" کے حضور میں انہوں نے بڑا گناہ کیا ہے ضرور بابا اُن سے ناراض ہے۔ اُس کے بھائی کے گھر اس دوران میں چار بچے ہوئے جبکہ اُس کے یہاں عیدو کے بعد دوسرا بچہ نہیں ہوا۔

"دریا پیر! " اُس کے دل کے خوف یکایک بول اُٹھا ـــ "اپنے بندے کو بخش ـــ !"

وہ بابا رشی سے اپنے گناہ بخشوا رہا تھا کہ سامنے سے ایک بے سوار گھوڑا سرپٹ

ہانپتا ہوا آیا۔

"اسے کیا ہوا ---؟" اچانک کھنہ صاحب نے مڑ کر پوچھا۔ اس سے پیشتر کہ حسن دین جواب دیتا ایک چھوٹا سا لڑکا اُس گھوڑے کے پیچھے ہانپتا ہوا ان کے پاس سے نکل گیا۔

حسن دین چونکا۔ سنبھل کر بولا۔ "سالا چوکیدار کا گھوڑا ہے۔ بڑا تیز طرار گرا دیا ہوگا سوار کو ---!" اور پھر قدم بڑھا کر۔ کھنہ صاحب کے برابر ہو کر اُس نے سرگوشی کی --- "صاحب اک نمبر اُٹھائی گیر ہے چوکیدار --- مارتا ہے افسروں سے ہمارا تو گھوڑا صاحب اپنا ہے۔ نوکری تو الگ رہا۔ ہم تو اپنے لڑکے تک کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا --- ہمیشہ اصیل گھوڑا رکھتا ہے ---!"

چند لمحہ تک وہ چپ چاپ چلتا رہا۔ پھر گویا اپنے آپ سے بات کر رہا ہو --- بولا --- "ہمارے پاس صاحب --- پہلے یہ گھوڑا نہیں تھا۔ دوسرا تھا --- ایک بار ایک سوار کو گرا دیا۔ دوسرا دن ہم نے اس کو بیچ دیا۔ ادھر تیز گھوڑا نہیں چل سکتا صاحب --- !" اور اُس نے اپنے گھوڑے کی تعریف کی --- "آپ لگام ڈھیلی چھوڑ دیں تو دھرتے آدمی نہیں ہوگا اور سیدھا اسپتھر تک لے جائے گا۔ ہم بابا پیم رشی کی قسم کھا کر کہتا ہے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔!"

"یہ باپم رشی اور بابا مارشی کیا الگ ہیں ---؟"

"نہیں صاحب، ایک ہی نام ہے۔ کوئی باپم رشی بولتا ہے۔ کوئی بابارشی۔ ہندو مسلمان سب کا پیر ہے۔ بابا پام دین ---!"

"پیام الدین۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔"

"ہم نے بھی بڑا نام سنا ہے سری نگر میں۔ کتنی دور ہے گلمرگ سے ان کا مزار؟"

"اجی صاب ۔! آنے جانے میں سات مائیل پڑتا ہے صاب۔ بولے گا تو ہم آج ہی دکھلا سکتا ہے صاب کو ۔!"

لیکن صاب چپ رہے۔ حسن دین چپ نہیں رہا۔

"بڑا مشا ہور رشی ہے بابا یام دین" بوجھ سے کمر جھکی کر کے باوجود تیز تیز ڈگ بھرتا اور گھوڑے کے ساتھ چلتا ہوا وہ بولا۔ "مغلوں کے وقت میں بڑا عہدہ تھا اس کا ایک ہزار جیر ملتا تھا۔ کشمیر دربار میں بڑا عزت تھا ۔ بابا صاب روز گھوڑے پہ سوار ہو کر سیر کو جاتا تھا ۔ ایک دن کرتا خدا کا کیا ہوا صاب۔ ڈھلان پہ بابا صاب گھوڑے سے اترا، کچھ دور پیدل چلتا رہا ۔ کیا دیکھتا ہے کہ چیونٹی کا قطار لگا ہے سردی میں وہ دانہ جمع کر رہا ہے ۔ اچانک بابا صاحب کے دل میں خیال گذرا کہ چیونٹی جیسا بے دماک (بے دماغ) جانور بھی آگے کا خیال رکھتا ہے ۔ اور میں انسان ہو کر اشتفرالمخلوقات[1]، ہو کر عاقبت کا فکر نہیں کرتا ۔ لعنت ہے مجھ پر۔ بس بابا صاب وہیں سے الٹے پاؤں واپس ہوا ۔ نوکری سے جا کر ستیفا دے دیا۔ گھر بار کو خیر باد کہا اور جا کر عشق مقام کے زین بابا کا پاؤں پکڑ لیا ۔ برسوں وہیں اس نے ریاضت کیا۔ سارے انہی رموز سے واقف ہو گیا ۔ تب زین بابا نے کہا کہ جا بیٹا ۔ اب تجھے سکھانے کے لائق میرے پاس کچھ نہیں رہا ۔ بابا صاب نے عشق مقام سے یہاں آگیا ۔ یہیں دین دنیا سے الگ جنگل میں یاد الٰہی میں مرصوف (معروف) رہا ۔ دنوں میں ہی اس کا مشا ہوری سارے کشمیر میں پھیل گیا اور لوگ دور دراز سے اس کا زیارت کو آنے لگا ۔ اب سرکار ہوا یہ کہ بابا صاب جب گھر چھوڑ کر آیا تھا تو اس کا بیوی بچے سے تھا ۔ وقت پر لڑکا ہوا ۔ جب وہ بڑا ہوا تو باپ کی تلاش کرتا ہوا یہاں آپہنچا ۔ بابا صاب لڑکے کو دیکھ کر بڑا خوش

---

[1] اشرف المخلوقات۔

ہوا۔ اُسے اپنے پاس رکھا۔ پھر کچھ دن بعد اُسے حکم دیا۔ جا تنہائی میں بیٹھ کر یادِ الٰہی میں من لگا۔ اب لڑکا سرکار ٹھہرا جوان۔ شہر کی ہوا لگے ہوئے۔ اس سے وہ کٹھن عبادت کیسے ہو۔ یہ بُرے لوگوں کی صحبت میں پھنس گیا اور بُرے کام کرنے لگا۔ جب بابا صاحب کے پاس اُس کی شکایت پہنچی تو اُس کو بڑا غصہ آیا۔ اُس نے خدا سے دُعا کیا کہ یا خدا ——— اگر میرا لڑکا بدچلن ہو تو اُسے اِس دُنیا سے اُٹھا لے۔ بابا صاحب ٹھہرا پہنچا ہوا فقیر۔ اس کی دُعا اور خدا ٹال دے ——— لڑکے کو خدا نے اپنے پاس بلا لیا ——— ۔"

لمحہ بھر تک حسن دین چپ چاپ چلتا رہا۔ پھر بولا۔ "صاحب ہم نے تو نہیں سُنا کہ بابا صاحب سے کسی نے منت مانا ہو اور وہ پورا نہ ہوا ——— بڑی دور دور سے لوگ بابا رشی کے درشن کو آتا ہے۔"

اب کے کھنہ صاحب بولے ——— "ہم نے سُنا ہے کہ بڑے منسٹر بھی وہاں جاتے ہیں۔"

"ہاں صاحب ——— بخشی صاحب نے حکم دیا ہے کہ وہاں تک بجلی کا لین لگانے کو ——— ۔"

وہ باتوں ہی باتوں میں وہاں تک پہنچ گئے۔ جہاں گھوڑے نے سواری کو گرا دیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک جوان لیکن ذرا سے موٹی لڑکی کو سہارا دے کر دو آدمی چلے جا رہے ہیں اور اُن کے خالی گھوڑے اُن کے پیچھے آ رہے ہیں۔

"کیوں صاحب ——— گھوڑے نے گرا دیا کیا ——— ؟" کھنہ صاحب اپنے گھوڑے پہ بیٹھے آگے بڑھتے ہوئے بولے۔

"جی ہاں ——— " لڑکی کے ساتھ چلنے والے ایک ادھیڑ نے کہا ——— "سرکار نہ جانے کیوں اپنے گھوڑوں کو اڑیل رہنے دیتی ہے۔"

اور کھنہ صاحب حسن دین سے بولے ۔ "ہم تمہارے ہی گھوڑے پر کے گلمرگ جائیں گے حسن دین ۔"

"کچھ فکر نہیں صاب ۔۔۔ ! جہاں تم بولے گا ہم لے جائے گا ۔۔۔ سارے گلمرگ کی سیر کرائے گا ۔ صاب کھلن مرگ جائے گا تو وہاں بھی لے جائے گا ۔ اس سے آگے جانے کو بولے گا تو افراپٹ٭ الپتھر اور فیروزن لیک بھی صاب کو دکھلائے گا ۔"

"بابا رشی کے مزار پر لوگ بکرے کی قربانی دیتے ہیں ۔۔۔" کھنہ صاحب کا من بابا رشی میں ہی اٹکا تھا ۔

"ہاں سرکار ۔۔۔ ! یہ میرا لڑکا ہے نا عبدل ، بابا رشی کی مہربانی سے ہوا ہے ہم نے دنبے کا قربانی دیا تھا اور سو روپیہ خیرات میں بانٹا تھا ۔"

کھنہ صاحب خیالات سے آریہ سماجی تھے ۔ قربانی کی بات انھیں ٹھیک نہیں لگی ۔۔۔ بولے "قربانی دینا کیا ضروری ہے ۔"

"نہیں صاب ۔۔۔ ! مسلمان قربانی دیتا ہے ۔ ہندو بھائی پھول چڑھاتا اور خیرات بانٹتا ہے ۔۔۔ جو بھی چڑھاوا چڑھتا ہے ۔ آدھا زیارت کو جاتا ہے آدھا وہیں غریب غربا میں بانٹ دیا جاتا ہے ۔"

"ہم چلیں گے 'بابا رشی' کے درشنوں کو !" اچانک کھنہ صاحب نے کہا ۔

٭ فروزن لیک :۔ الپتھر جھیل جب تک جمی رہتی ہے اسے فروزن لیک کہتے ہیں ۔

گلمرگ کی چڑھائی شروع ہو گئی تھی گھوڑوں کی رفتار سست اور اُن کے پیچھے چلنے والوں کی رفتار سست تر ہو گئی تھی۔

حسن دین گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلنے کے بجائے پہلے کی طرح ذرا پیچھے چلنے لگا۔ گھوڑا جب چلتے چلتے پہاڑ کی دراڑوں میں اُگی گھاس پر منھ مارنے کو رُک جاتا تو وہ بے خیالی میں ٹٹکاری بھر دیتا اور پھر اپنی اُدھیڑ بن میں لگ جاتا۔ اُس نے صاحب کو بابا رشی جانے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اس سے وہ دل ہی دل میں بڑا خوش ہوا تھا۔ اُس نے پھر ایک بار ٹنگمرگ سے گلمرگ۔ گلمرگ سے بابا رشی اور وہاں سے واپسی کا حساب لگایا ـــ تیس روپے تو ضرور مل جائیں گے اگر وہ اُنھیں الپتھر اور فیروزن لیک تک لے جائے تو پانچ روپیہ اور کہیں نہیں گئے ـــ خوشی سے اُسے سانس رُکتی سی محسوس ہوئی ـــ اچانک اُسے خیال آیا کہ سیٹھ اگر زیادہ دن یہاں ٹھہرنے آیا ہو تو ہو سکتا ہے واپسی پر کوئی دوسرا گھوڑا کرے ـــ کر بھی لے گا۔ ؟" اُس نے دل ہی دل میں کہا ـــ "بس اُسے ایسا خوش کر دوں گا کہ وہ کسی دوسرے گھوڑے والے کی بات ہی نہ سوچے" لیکن اس فیصلے کے باوجود ایک دو ڈگ بھر کر جلدی جلدی سیٹھ صاحب کے برابر ہوتے اور چڑھتی سانس کو قدرے روکتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"صاب تم گلمرگ، کتنا دن ٹھہرے گا ـــ ؟"

پہلا زمانہ ہوتا تو وہ ہفتوں، مہینوں کی بات پوچھتا۔ لیکن گلمرگ تو اُجاڑ تھا اُس کی گذشتہ شان وشوکت کی یاد میں اُسے صرف دیکھنے کو مسافر آتے تھے۔ دو چار دن یا زیادہ سے زیادہ ہفتہ بھر رہ کر چلے جاتے تھے۔

"ہم کل شور چلے جائیں گے ـــ" گھنہ صاحب نے کہا ـــ "ہمیں بہت جلدی ہے۔ گلمرگ دیکھنے کے بعد ہم پہلگام جائیں گے۔ اور وہاں سے امرناتھ کی یاترا میں

شامل ہوں گے ۔ "

حسن دین پھر پیچھے ہو گیا ۔ وہ خوش ہوا کہ سیٹھ ایک ہی دن گلمرگ رہے گا اُس نے دل کی گہرائیوں سے خدا کا شکرادا کیا کہ اُس نے سحر کے وقت کی اُس کی دُعا قبول کرلی ۔ سحر کی دعا کی بڑی اہمیت ہے ۔ خدا کے حضور میں اُس کی بڑی قدر ہے یوں بھی اُس نے بزرگوں سے سُن رکھا تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں کبھی منہ سے ایسی دُعا یا بد دعا نکلتی ہے جو لفظ بلفظ پوری ہو جاتی ہے ۔ اس لئے اُن کا کہنا تھا کہ سوچ سمجھ کر منھ سے بات نکالنی چاہیئے ۔ آج علی الصبح اگر اُس نے کچھ اور مانگ لیا ہوتا ۔ تو وہ بھی پورا ہو جاتا ...... اگر اُس نے لاکھ روپے مانگے ہوتے ..... ؟ اور اُس نے دیکھا کہ وہ فجر کی نماز پڑھ رہا ہے اور اس نے خدا سے دعا مانگتے وقت ایک لاکھ روپیہ مانگا ــــ پھر اُس نے دیکھا کہ وہ اصطبل میں ایک کونہ کھود رہا ہے ۔ کہ وہاں دروازہ لگانے کو بلی گاڑے ۔ تبھی اس کا پھاوڑا کسی ٹھوس چیز سے ٹکراتا ہے وہ اور کھودتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک کالنے کا گھڑا ہے ۔ جلدی سے کھودن بند کر کے وہ گڑھے میں مٹی ڈال دیتا ہے کہ کہیں ممدو نہ آجائے یا کہیں پڑوسی نہ دیکھ لے ..... دن کو وہ اور اُس کی بیوی باہر سے اصطبل پر ٹاٹ کا پردہ لگا دیتے ہیں ۔ حسن دین بہانے سے ممدو کو ادھر سُلا دیتا ہے اور آدھی رات کے وقت جب سارا گاؤں سویا رہتا ہے وہ اور اُس کی بیوی ہری کین کی روشنی میں زمین کھودتے ہیں (اس بار باہر کے دروازے کے پاس نہیں بلکہ اندر کے کونے میں کھود دیتے ہیں ــــ پہلی جگہ دروازے اور گلی کے پاس ہونے سے لاشعور اُن کے سپنے میں جگہ بدل دیتا ہے ۔ اس بارے میں رات اور دن کے سپنے ایک طرح کی سہولیات دیتے ہیں ۔) کافی گہرائی میں ۔ اس طرح صبر کے ساتھ آہستہ آہستہ کھود کر باہر یا ادھر آواز نہ جائے دونوں میاں بیوی بڑی احتیاط سے کالنے کا گھڑا نکالتے ہیں ۔ اس کا ڈھکن لاکھ سے جڑا ہے ۔ بڑی احتیاط سے اُسے

کھولتے ہیں ـــــ دیکھتے ہیں سونے کی مہروں سے بھرا ہے۔ جوہری کبن کی اس مدھم دھندلی روشنی میں بھی جگمگا اُٹھتی ہیں۔ حسن دین مٹھی بھر مہریں نکالتا ہے۔ اور یاسمین کی پھٹی پڑتی ہوئی آنکھوں کے سامنے اُسے کھولتا ہے۔ جو ٹھیک سے دیکھنے کو ہری کبن ادہر کو اُٹھاتی ہے۔ دونوں میاں بیوی حیران و ششدر لیکن ناقابل بیان خوشی سے ہتھیلی پر چم چم کرتی' اُن مہروں کو دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ ہلکا سا کھٹکا ہوتا ہے۔ دونوں چونکتے ہیں۔ ممدو اصطبل کے دروازے میں کھڑا ہے۔ آنکھیں ملتے ہی کھیسیں نکوس دیتا ہے۔ دونوں اس گھبراہٹ میں اُسے اپنے راز کا حصہ دار بنا لیتے ہیں۔ حسن دین کہتا ہے کہ گھر کے جتنے نفوس ہیں اُن سب کو برابر برابر حصے ملیں گے اب جب ہمیں خدا نے اتنی دولت دی ہے کہ ہم اپنی باقی ماندہ زندگی آرام سے گذار دیں ـــــ ہمیں چاہیئے اپنے گھوڑوں کو جنہوں نے تنگی ترشی میں ہمارا ساتھ دیا ہے اور بھوکے پیٹ رہ کر ہماری خدمت کی ہے پورا آرام دیں۔ ان سے آئندہ کسی طرح کا کام نہ لیں۔ ایک نوکر اُن تینوں کی خدمت کے لئے رکھ دیں اور انہیں خوب کھلائیں پلائیں اور آرام دیں۔ اُن کی اِسی خدمت کو درمیان میں رکھتے ہوئے حسن دین اُن کے بھی برابر تین حصے کرتا ہے۔ ایسا کرتے وقت چہرہ کچھ عجیب سے روحانی جلال سے تمتما اُٹھتا ہے۔

لیکن یہیں ممدو کا گدھا پن ظاہر ہوتا ہے۔ وہ گھوڑوں کو حصہ دینے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتا ـــــ حسن دین کل مہروں کے آٹھ حصے کر کے ایک ممدو کو دینا چاہتا ہے۔ ممدو چوتھا حصہ مانگتا ہے۔ حسن دین اس بات پر بھی تیار ہو جاتا ہے کہ ایک گھوڑا اور اس کا حصہ بھی وہ اُسے دیگا۔ لیکن وہی ممدو جو اس کے سامنے آنکھ بھی نہ اُٹھا سکتا تھا اُسے گالیاں دینے لگتا ہے ـــــ نہ جانے کون پولیس کو خبر کر دیتا ہے۔ دھڑ دھڑاتی پولیس آ پہنچتی ہے۔ اور نہ صرف گھوڑا اُٹھا لے

جاتی ہے بلکہ انہیں بھی ساتھ گرفتار کر لیتی ہے۔۔۔۔۔

حسن دین زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ اس کی پیشانی پہ پسینہ آ گیا تھا گھوڑا پہاڑ میں آگ جھاڑیوں میں منہ مار رہا تھا اور کیپٹن صاحب گرنے کے خوف سے اندھا دھند گھوڑے کی لگام کھینچ رہے تھے۔ یکا یک وہیں ایک جھاڑی سے ایک پتلی سی شاخ توڑ کر زور سے کالی دیتا ہوا حسن دین اس کی جانب بڑھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ شاخ گھوڑے کو مٹھی کو چھوتی، وہ چل پڑا۔

حسن دین نے پیٹھ کے بوجھ کو ٹھیک کیا اور پھر بڑھ چلا۔ اس کا دل پھر انہی ہوائی قلعوں میں کھو گیا۔ اس بار اس کے لاشعور نے دوسری سہولت پیدا کر دی اس نے دیکھا کہ ممدو اور اس کا لڑکا گھوڑے سے لیکر کا منار تک گئے ہوئے ہیں وہ طبیعت علیل ہونے کی وجہ سے گھر پہ رہ گیا ہے۔ اس کی جگہ اس کا بڑا بھائی چلا گیا ہے۔ یونہی من کو لگانے کے لئے وہ اصطبل میں کام کرنے لگتا ہے کہ اس کا پاؤں ٹوٹا گھوڑے سے جا ٹکراتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو بلاتا ہے اور وہ دونوں راتوں رات نہریں نکال کر چھت کے کھوتوں میں دو ندچادر کرکے چھپا دیتے ہیں۔ دوسرے دن شام کو اس کا بڑا بھائی ممدو اور اس کا لڑکا واپس آتے ہیں۔ حسن دین کی علالت سونے کی چمکتی نہریں کو دیکھتے ہی ایک دم ٹھیک ہو جاتی ہے۔ وہ ٹنگمرگ جا کر شراب کی بوتل اور کھانے پینے کا سامان لے آتا ہے۔ ادھر سے اس کی بوڑھی ماں اور بھائی کے بیوی بچے بھی آ جاتے ہیں۔ ایک دو پڑوسی بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ مرد لوگ پیتے ہیں اور عورتیں اور بچے نمکین چائے کی بجائے قہوہ پیتے اور بڑھیا سیخیر و اور دودھ روٹی کھاتے ہیں۔ بھیگی رات تک موج مناتے رہیں۔۔۔۔ کہ اچانک چھت پر دو بلیاں لڑنے لگتی ہیں ایک دھم چوکڑی مچا دیتی ہیں ـــــ اور نقشیں کسنی نہریں نیچے گرنے لگتی ہیں۔ سارے

گاؤں میں خبر پھیل جاتی ہے کہ حسن دین کی چھت سے سونا برس رہا ہے اور پھر ہوائی کی طرح پولیس پہنچ جاتی ہے۔ چھت کا تنکا تنکا اُکھاڑ پھینکتی ہے۔ ساری قبریں کھود لے جاتی ہے اور گھاتے میں اُن کو بھی پکڑ لیتی ہے اور اُن کے گھروں میں آخر دو نوٹ کے صندوق اُن کی رہائی کی خاطر بک جاتے ہیں.....

حسن دین سر کو جھٹکا دیتا ہے۔ لاشعور پھر سہولت پیدا کر دیتا ہے.....
وہ دیکھتا ہے کہ ایک نہیں دو گھڑے نکلے ہیں۔ وہ ایک گھڑا دوسری جگہ چھپا دیتا ہے ادھر گھاس پھوس ڈال کر گھوڑا باندھ دیتا ہے اور ننگر گ کے دیوان جی سے وہ کہتا ہے کہ اُسے ایک گھڑا خزانہ ملا ہے وہ سرکار کو اطلاع دینے چلا آیا ہے۔ وہ دو پولیس کے سپاہی لئے پہنچ جاتے ہیں اور جگہ کھود کر گھڑا نکالتے ہیں۔ جب ایک گھڑا نکل آتا ہے تو وہ سپاہیوں کو دوسری جگہ کھودنے کا حکم دیتے ہیں۔ جس جگہ سے اُس نے گھڑا نکالا تھا وہ مٹی جلدی نکل آتی ہے اور صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہاں سے گھڑا نکالا گیا ہے ...... اور آخر وہی ہوتا ہے۔ وہ بُری طرح پٹتا ہے۔ اُس کی بیوی اُس کی جان کے خوف سے دوسرے گھڑے کی بات بتا دیتی ہے۔ پولیس اُسے چوری کے الزام میں پکڑ لیتی ہے۔

حسن دین نے زور سے سر کو جھٹکا دیا۔ اُس کی دولت ہر بار ہاتھ سے نکلتی رہی تھی۔ تیز اور قدآور سے بڑے گرگٹ کو پکڑنے کی کوشش کرنے والے بلّی کے بچّے کی طرح وہ کبھی ادھر سے اور کبھی اُدھر سے اُسے جھپٹتا رہا۔ لیکن وہ ہاتھ میں آ کر نکل جاتی رہی۔ ایک لاکھ کی بات دور رہی۔ اُس نے کبھی ایک ہزار روپیہ بھی نہ دیکھا تھا۔ سونے کی قبریں اُس کے دادا پردادا نے دیکھی ہوں تو اور بات ہے۔ لیکن اُن کے وہ [illegible] دیکھ پانے کے قابل نہ تھا

آخری بار سر کو جھٹکا دے کر اُس نے قدم بڑھائے۔ لیکن چڑھائی ختم ہو گئی تھی راستے میں چھوٹا سا گھاس کا قطعہ اور دو ایک دیودار کے پیڑ تھے ـــــ اور آگے چلنے والے گھوڑے جھرمٹ میں اُسے لے رہے تھے۔

کھنہ صاحب نے دیکھا کہ اُن کی بیوی اور بچّہ اُتر رہے ہیں۔ کچھ دوسری سواریاں بھی اُتر گئی تھیں اور گھوڑے وہیں گھاس میں منہ مار رہے تھے۔

"کیا بات ہے ـــــ ؟ یہاں کیوں رک گئے ـــــ" کھنہ صاحب نے یکایک مڑ کر حسن دین سے پوچھا۔

پیٹھ کا بوجھ زمین پر رکھتے ہوئے حسن دین نے کہا۔ "صاب اتنا چڑھائی چڑھ کر آتا ہے۔ یہاں گھوڑا آرام کرتا ہے۔ ذرا ہاتھ لگا کر دیکھو۔ کتنا پسینہ پسینہ ہو رہا ہے۔ !"

کھنہ صاحب نے بے خیالی میں گھوڑے کی پسلی پر ہاتھ رکھا۔ اُن کے ہاتھ گرم پسینے سے تر ہو گیا۔ "حسن دین ہمیں گھوڑے سے اُتارو ـــــ !" انہوں نے ایک دم اُسی کارڈرائے کی پتلون سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔

"نہیں صاب ـــــ ! اُترنے کا ضرورت نہیں۔ تم بیٹھو ـــــ !! کچھ فکر نہیں گھوڑا پانچ دس منٹ رُک کر چلے گا۔ !"

اگرچہ اُن سے پہلے آنے والوں میں ایک دو مسافر گھوڑوں پر چڑھنے لگے تھے۔ لیکن کھنہ صاحب نے کہا۔ "نہیں ! ہم اُتریں گے۔"

حسن دین نے انہیں سہارا دے کر اُتار دیا ـــــ وہ اپنی بیوی بچے سے جا ملے۔

"کیوں شکن ! تھک تو نہیں گئیں۔" انہوں نے اپنی بیوی سے پوچھا اور پھر اُس کا جواب سُنے بنا وہ اپنے لڑکے کی طرف پلٹے۔ اُس کی دونوں بغلوں

میں ہاتھ دے کر اُسے پیار سے جھنجھوڑتے ہوئے اُسے چوم کر اُنہوں نے کہا "اور تم گگلو ر"

"ذرا بھی نہیں باپو جی ــــ!" اور وہ نوزائیدہ بچھڑے کی طرح کود کر جاسے مارنے لگا۔

"دیکھو ــ دیکھو ــ!! گھوڑے کے پیچھے مت جاؤ۔ دو لتی مار دے گا ــ" حسن دین نے بڑھ کر بچے کو روک لیا۔

وہ اُس کا ہاتھ چھڑا کر پھر کود کر طے مارنے لگا ــ اور دوسری طرف بھاگ گیا۔

لمحہ بھر تک حسن دین کھڑا اس بچے کو دیکھتا رہا۔ عیدو بھی اتنی ہی عمر کا ہے۔ وہ ایک سال بڑا ہو گا۔ لیکن اُس کی قسمت میں یہ سب کہاں ہے اُسے تو بچپن ہی سے روزی کمانے کی فکر دامن گیر ہو گئی ہے۔ اگر کشمیر میں امن رہا تو وہ یقیناً ہی عیدو کی شادی کرے گا۔ اُس کے بچوں کو پڑھائے گا۔ اور اُنہیں ایسا ہی بنائے گا۔ اُسے پچھلے سال کا ایک واقعہ یاد آیا۔ انگریز بچوں کو اپنے ماما پتا کے لئے ڈیڈی۔ ممی۔ پاپا۔ ماما کہتے دیکھ کر اُسے کبھی حسد نہ ہوا تھا.... لیکن اودھر ایسے ہندوستانی بھی آنے لگے جن کا معیار بہت بلند تھا۔ جو افسر بھی نہیں تھے کئی تو اُن میں سے ٹٹ پونجیے دوکاندار تھے جنہیں وہ لوگ جل کر "دال وزیٹر" کہتے تھے دال بھات کھا کر پیدل کشمیر کی جنت کا لطف اُٹھانے والے ــ جب اُن کے بچے بھی ڈیڈی ممی، پاپا ماما پکارتے تھے تو حسن دین کا جی چاہتا تھا کہ اُس کا عیدو بھی اُسے ابا ابا کہنا چھوڑ کر ڈیڈی کہے...... اور پچھلے برس اُس نے ایک دن یاسمین سے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا.....

لیکن نہ عیدو اُس کی بات سمجھا ــ نہ یاسمین ــ جب اُس نے بات

سمجھائی تھی تو وہ قہقہہ مار کر ہنس دی تھی۔ "کل تم مجھ سے بھی کہو گے کہ تم بھی پوڈر سُرخی لگاؤ ـــ اور ان کھتنیوں کی طرح ننگے سر ننگے بدن گھومو ـــ!" اور عیدو نے ایک بار بھی اُسے ڈیڈی نہیں کہا۔

اِس بات کا خیال آتے ہی حسن دین اپنے آپ ہنس دیا ـــ لیکن فوراً ہی وہ سنجیدہ ہو گیا۔ کھر کرے مارتے اُس غول سے گلو کو دیکھ کر اُسے خیال آیا کہ وہ عیدو کو بڑھاپے کا اُس کی شادی کر دے گا ـــ اُس کے بچے جب اُن سے اسکول کالج میں پڑھیں گے تو ضرور اُس کو پاپا۔ ڈیڈی ملائیں گے۔ اُس کی زندگی تو جیسے ڈھوتے بیتا گئی۔ لیکن بچے ضرور صاحب بنیں گے۔ بخشی صاحب کہتا ہے تعلیم سب کو مفت ملے گی۔ پھر عیدو اور اُس کے بچوں کو صاحب بننے میں کونسی رکاوٹ رہ جائے گی۔ وہ نہ سہی اُس کے بچے تو سکھ آرام پائیں گے۔

اور اُس نے سوچا کہ مستقبل کے ہوائی قلعے بنانے کے بجائے اُسے حال کی فکر کرنی چاہیئے۔ مسافروں سے پتہ کرنا چاہیئے کہ کوئی الیقر یا افرابٹ بھی جانا ہے یا نہیں ـــ اونچی جگہوں پر جانے اور نئی نئی دید جگہوں کو دیکھنے میں بھی وزیٹر ہی زیادہ ٹر ساحن پائیں گے۔

لیکن جن سواریوں کے گھوڑے اکھٹے کئے ہوئے تھے اُن میں سے کوئی بھی افرابٹ یا الپھتر جانے والا نہیں تھی۔ ایک بیوپاری تھا جو گلمرگ کا جائزہ لینے آیا تھا کہ وہاں کچھ کاروبار کی گنجائش ہے یا نہیں۔ دو سرکاری نوکر تھے۔ صرف دو وزیٹر ایسے تھے جن کا ارادہ اُدھر جانے کا تھا لیکن وہ "ہفتہ بھر وہاں ٹھہرنے کو آئے تھے اور کچھ آرام کر کے کھلن مرگ جانا چاہتے تھے۔ یہ اطلاع حسن دین نے اُن کے سائیسوں سے حاصل کی۔

گھوڑے وہاں آٹھ دس منٹ سے زیادہ نہیں رُکتے تھے۔ کچھ سوار تو اُترتے

ہی نہیں تھے ...... گھوڑوں پر ہی بیٹھے رہتے تھے جو اُتر گئے تھے وہ پھر سوار ہوئے اور دائیں ہاتھ کو اُوپر جاتی والی سڑک کی طرف بڑھ گئے۔

حسن دین واپس مڑا۔ وہ کھنہ صاحب سے سوار ہونے کو کہہ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے وہ پارٹی بھی آ پہنچی جن کے ساتھ کی لڑکی گھوڑے سے گر گئی تھی۔ وہ شاید کسی دوسرے گھوڑے پر سوار سب سے آگے تھی۔ اُس کے پیچھے ایک سوٹ بوٹ میں ملبوس قدرے ادھیڑ عمر شخص تھا۔ سب کے پیچھے ایک نوجوان پیدل آ رہا تھا۔

کھنہ صاحب گھوڑے پر سوار ہونے والے تھے کہ اُن کو دیکھ کر ذرا رک گئے۔

"کیوں صاحب — کچھ چوٹ تو نہیں آئی! ان کے —"

لڑکی شرما گئی۔

"نہیں جی — بچ گئی —" جواب ادھیڑ عمر آدمی نے دیا۔

"کتنے دن کا پروگرام ہے؟"

"چار یا پانچ دن ٹھہرنے کا ارادہ ہے —"

"ہم تو کل ہی واپس آ جائیں گے — مہینہ بھر پہلے کسی طرح دفتر سے چھٹی پا کر آئے ہیں۔ اور مہینہ بھر میں تو کشمیر کا ایک کونہ بھی ٹھیک سے نہیں دیکھا جا سکتا —"

اور کھنہ صاحب گھوڑے کی طرف بڑھے لیکن چڑھنے سے پہلے انہوں نے پوچھا — "کس ہوٹل میں ٹھہرنے کا ارادہ ہے آپ کا —؟"

"ابھی تک تو فیصلہ نہیں کیا — چل کر دیکھ لیتے ہیں۔ گلمرگ ہوٹل ہے خالصہ ہوٹل ہے۔ اور بھی کہتے ہیں کہ بازار میں ٹھہرنے کا انتظام ہے —"

"ہم تو خالصہ ہوٹل میں ٹھہریں گے —!"

اور یہ کہتے ہوئے کھنّہ صاحب حسن دین کی مدد سے گھوڑے پر سوار ہو گئے وہ لوگ بھی زیادہ دیر نہیں رُکے ۔ بہت دُور تک تو پیدل آئے تھے، گھوڑوں سے اُترے بھی نہیں ۔ کھنّہ صاحب کی پارٹی چلی تو وہ لوگ بھی چل پڑے ۔ نوجوان بدستور سب کے پیچھے پیدل چلا ۔

حسن دین غور سے سب کی باتیں سُنتا رہا ۔ کچھ دُور چلنے پر وہ نوجوان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا ۔ پھر یکایک اُس نے پوچھا ۔

"کیوں صاحب — ! تم کیا دلّی سے آیا ہے ؟"

"ابھی تو دِلّی سے آئے ہیں ۔ لیکن ہم دلّی کے رہنے والے نہیں ۔ !"

"کیا کلکتہ بمبئی سے آیا ہے ۔ ؟"

"نہیں ہم افریقہ سے آیا ہے ۔ !"

"افریقہ کیا امریکہ کا صوبہ ہے !"

"افریقہ ہندوستان اور امریکہ کے بیچ میں ہے ۔ جہاں حبشی لوگ رہتے ہیں سا !"

حسن دین نے غور سے اُس جوان کو دیکھا ۔ پھر جھجکتا ہوا بولا ۔

"لیکن تم تو ہندوستانی ہے ۔"

"ہاں ہم ہندوستانی ہے ۔ لیکن ہمارا دادا اُدھر چلا گیا تھا ۔ ادھر ہمارا کاروبار ہے ۔ ہم ہندوستان دیکھنے آیا ہے ۔"

"کشمیر میں کیا دیکھا ؟"

"ابھی تو ہم آیا ہے — سرینگر میں ڈل، نگین، شالامار، نشاط دیکھے ہیں ۔ تین چار دن گلمرگ دیکھیں گے ۔ پھر پہلگام جائیں گے ۔ !"

حسن دین کو اپنی بات کہنے کا موقع ملا ۔

"گلمرگ تو صاب - ! کشمیر کا جنت ہے - ادہر قبائلی لوگ نے اسے برباد کر دیا ـــــ مال ، سامان - وہ یہاں سے ساتھ لے گیا - لیکن اس کا خوبصورتی تو صاب چور ، ڈاکو نہیں لے جا سکتا - افراہٹ ، الپتھر ، اور فیروزن لیک کو تو صاب اب بھی دُور دُور سے لوگ دیکھنے کو آتا ہے - ابھی دو دن پہلے چار ولائتی آیا تھا اور کانشا رنگ اور توس میدان گیا تھا ـــــ صاب ـــــ جب تم گلمرگ آیا ہے تو تم کو "بابا رشی" فیروز پور نالا ، کھلن مرگ ، الپتھر ، فیروزن لیک ضرور دیکھنا چاہیئے ہمارا صاب تو کل واپس بھیج جانا ہے - تم صاب ـــــ ! چاہے گا تو جہاں تم بولے گا ہم تم کو گھمائے گا ! ہمارا گھوڑا صاب ایک دم اصیل لا - !"

"تمہارا صاب کیا الپتھر اور فیروزن لیک دیکھنے جا رہا ہے ؟"

"بول نہیں سکتا صاب ! بابا رشی تو وہ جانے کو بولتا ہے - کھلن مرگ بھی شاید وہ جائے - اگر تو صاب - اگر ساتھ ملا تو جائے گا ـــــ نہیں تو کھلن مرگ سے واپس لوٹے گا - "

"ہم کل کھلن مرگ جانے کی سوچتے ہیں - "

"اگر صاب تم افراہٹ اور فیروزن لیک جانا مانگتا ہے تو تم کو صبح چلنا چاہیئے - ایک بجے افراہٹ کی چوٹی پر پہنچنے کو مانگتا ہے - افراہٹ کی چوٹی سے اتنا خوبصورت دِکھ ملتا ہے صاب کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے - ہمارا صاب اگر اوپر چلے گا تو ہم تم سب کو فیروزن لیک نکس لے چلے گا - ہم صاب کا گائیڈ کا کام بھی کرتا ہے۔"

حسن دین اپنی جما رہا تھا کہ پیچھے سے وہی لڑکا ایک گھوڑے کو تیز دوڑاتا لایا اور اُن کے پاس آ کر اُتر گیا -

"نہیں - نہیں ہم تمہارے گھوڑے پر نہیں چڑھیں گے - " اس نوجوان نے کہا -

"صاب دوسرا والا گھوڑا ہے ' ــــ ایک دم اصیل ہے۔ اس کو تو ہم اڈے پر چھوڑ آیا ہے"۔

"وہ نہیں ہم اتنی دور پیدل آئے ہیں تو آگے بھی پیدل ہی جائیں گے ۔!"

"صاب ابھی بہت راستہ باقی ہے۔ صاب ہم غریب مارا جائے گا ــــ ٹھیکیدار ہمارا پیسہ کاٹے گا ۔ صاب ہم غریب آدمی ہے !"

اور وہ لڑکا گھوڑا وہیں چھوڑ کر اُس کے پاؤں پڑ گیا ــــ گھوڑا چپ چاپ بے حس و حرکت کھڑا رہا ۔ پہاڑ میں آگی جھاڑیوں میں بھی اُس نے منہ مارنے کی کوشش نہیں کی ۔ نوجوان نے لمحہ بھر کے لئے پاؤں میں پڑے اُس لڑکے اور چپ چاپ کھڑے اس گھوڑے کو دیکھا ۔ دونوں کی شکل و صورت پر کچھ ایسی اُداسی تھی۔ کہ وہ بغیر دوسرا لفظ کہے لگام تھام کر اُس پر جا چڑھا۔ اور وہ گھوڑا ، جو لگتا تھا کہ جانے اب آگے چلے گا بھی یا نہیں ، ایک دم دوڑ پڑا ۔

"وار وار وار وار ...... !" لڑکا اُس کے پیچھے بھاگتا ہوا بولا ــــ اور گھوڑا آہستہ آہستہ چلنے لگا ۔ لیکن اتنے میں وہ آگے جانے والے لوگوں سے جا ملا تھا ۔

حسن دین نے اپنے بوجھ کو ایک بار پھر ٹھیک کیا..... اور قدم بڑھا کر چل پڑا ۔

جو آتا ہے گلمرگ کے بعد پہلگام جاتا ہے ۔ اور گلمرگ میں دو دن رہتا ہے ۔ تو پہلگام میں دو ہفتے ــــ حسن دین نے سوچا ــــ پہلگام کے سائیسوں اور کسانوں کی چاندی ہے ۔ گلمرگ جن لوگوں کے لئے بنا تھا جو یہاں کی سردی میں اپنے ملک کی گرمی پاتے تھے ۔ وہ لوگ تو سات سمندر پار چلے گئے ۔ اب آتے ہیں یہاں ہندوستانی جنھیں گلمرگ میں کھانسی زکام ہو جاتا ہے ۔ یہاں کی ٹھنڈی ، پاکیزہ ہوا سے جنھیں

نمونیہ کا ڈر رہتا ہے۔

لیکن اُن کا بھی کیا قصور ہے —، اُس کے خیالات نے پلٹا کھایا — گلمرگ میں ہے ہی کیا —؟ ایک ڈھب کی دکان نہیں — ڈھب کا ہوٹل نہیں — ڈھب کا بازار نہیں — نہ ڈاکٹر — نہ ہسپتال — کوئی رہنا بھی چاہے تو کیونکر —؟ نیڈوز ہوٹل ہے — لیکن سبھی تو نیڈوز میں نہیں جا سکتے۔ رہا پہلگام — سو اس کی کیا بات ہے۔ دسیوں جگہ تو وہاں سے راستے جاتے ہیں۔ چندن واڑی، سٹیشن ناگ، اور امرناتھ کو وہاں سے لوگ جائیں، آڑو - لدروٹ کولاہائی — دودھ سر اور رنگین جھیلوں کو وہاں سے لوگ جائیں - پھر لدر کا کنارا، لوگ وہاں خیموں میں رہیں - وہیں نہائیں، وہیں کپڑے دھوئیں، گلمرگ کا کیا کریں سیاہ بھنت تھا تو پہلگام ہندوستانیوں کی جنت ہے - شیر کشمیر کی کوششوں سے جب کشمیر میں امن ہوا اور وزیٹر آنے لگے اور اُس نے سنا کہ تین ہزار آدمی امرناتھ کی یاترا کو چلے گئے — تو اُس نے سوچا تھا کہ اگلے سال وہ اپنے گھوڑے کو لے کر پہلگام چلا جائے گا — ..... امرناتھ کی یاترا شروع ہوئی ہے تو اگلے سال پانچ ہزار لوگ جائیں گے۔ وہ سیزن بھر کما کر گھر آئے گا۔ لیکن دوسرے سیزن کے شروع میں جب اُس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا تو اُس کی بوڑھی اماں نے روڑا اٹکا دیا — خدا مچھلی کو پانی میں پیدا کرتا ہے - وہیں اُسے خوراک دیتا ہے - اُس نے ہمیں یہاں پر پیدا کیا ہے تو ہمیں کھانے کو بھی دے گا - اگر سبھی گھوڑوان پہلگام چلے جائیں تو وہاں بھی بھوکوں ہی مریں گے۔ پہلگام میں امرناتھ ہے تو گلمرگ میں "بابا رشی" ہے۔ اور بابا رشی کی شہرت امرناتھ سے کم نہیں — دعا مانگ کہ امن قائم رہے اور وزیٹر آئیں - کہیں دوسری جگہ جانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ جیسے وزیٹر آنے لگے ہیں - تو گلمرگ دیکھنے ضرور آئیں گے - کوئی سری نگر آئے - اور گلمرگ نہ آئے -؟ آپ سے

دو دو چار چار دن رہیں دو تو آئیں جائیں۔ روز سواری گھر کی سوکھی باہر کی چپڑی سے بہتر ہے!"

اور وہ یہاں رہ گیا تھا۔ ماں کی بات سچ نکلی تھی — پچھلے سال سے سیزن کچھ بھرنے لگا تھا۔ اور اسی سال بخشی صاحب نے اُجڑے گلمرگ میں سرکاری دکانیں کھلوا دی تھیں۔ پھر بات اتنی ہی نہ تھی۔ ان کی کھیتی بھی تھی۔ اخروٹ، خوبانی اور آڑو کے درخت بھی تھے۔ انہیں درختوں سے توڑنا اور بازار میں فروخت کرنا عورتوں کا کام نہ تھا — یہ ٹھیک ہے کہ اُس کا بھائی کھیتی دیکھتا تھا۔ لیکن اکیلے کے بس کا کام نہ تھا —

اس کے سامنے پچھلے کچھ برس گھوم گئے۔ جب قبائلیوں کے حملہ کی وجہ سے ٹورسٹ نہ آنے کے برابر آتے تھے اور اُس کے خاندان نے انہی درختوں کی بدولت اپنا پیٹ بھرا تھا۔ کپڑے کے بغیر چل سکتا ہے لیکن پیٹ کے دوزخ کو تو ایندھن ملنا ہی چاہیئے اخروٹ اور خوبانی اور آڑو کھا کر انہوں نے تنگی کے وہ دن کاٹے تھے۔

لیکن اب تو دلّی سے چاول۔ گیہوں اور اناج آنے لگا تھا۔ اور کشمیر کی چیزوں کے باہر جانے پر پابندی لگ گئی تھی۔ ایک پیسے کی سبزی یا دال، مکئی یا چاول باہر نہ جا سکتے تھے اور ان کے درخت خوب پھل رہے تھے۔ پچھلے سال انہوں نے پچیس روپیوں کے اخروٹ بیچے تھے۔ اس سال تو پچاس روپے بھر کے اخروٹ لگیں گے۔ لکڑی کے ان گھڑ صندوق اخروٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ بیس تیس روپے دوسرے پھلوں سے کما لینا بڑی بات نہیں — اگر یہ سیزن لگ جائے اور اگر وہ سب خرچ نکال کر دو تین سو روپے بچا لے تو سو روپے سردیوں کے لئے الگ کر کے وہ اس سال عیدو کا نکاح پڑھا دے.....

یکایک اُس کے کانوں میں اپنا نام پڑا۔ کھنہ صاحب اُسے پکار رہے تھے۔

گھوڑا ایک دم رُک کر کنارے کی جھاڑیوں میں منہ مار رہا تھا — اور کھنہ صاحب بے تحاشا لگام کھینچ رہے تھے اور اُن کی خوف زدہ آواز سنائی دے رہی تھی —

"حسن دین ...... دین ... حسن .... د.... ی.... ی ...ن .... !"

"صاب — تم گرے گا نہیں — ! گھوڑا نیچے جھکے تو تم پیچھے کو تن جاؤ"

وہ زور سے چلایا۔

"پیچھے تو تن جائیں — لیکن تم ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے —" کھنہ صاحب چلائے۔ "دیکھو — ! سب لوگ کہاں چلے گئے — یہ کیسا گھوڑا ہے جو چلتے چلتے بیچ میں رُک جاتا ہے۔ اور تم کہتے تھے لگام چھوڑ دو سید صاحب پتھر لے جائے گا۔ !"

"صاب — ! ایکدم اصیل جانور ہے — مگر جانور ہے۔ آدمی نہیں گھاس پتی میں منہ مار دیتا ہے۔ صاب۔ ذرا ایڑی لگائیے تو سر پٹ چلے۔"

اور اُس نے ہاتھ کی پتلی سی ٹہنی اٹھائی — اور کھنہ صاحب نے ایڑ لگائی۔ گھوڑا اُچھل کر چلا تو کھنہ صاحب نے بے تحاشہ لگام کھینچی۔ اور حسن دین چلایا —

"وار وار ...... وار .... وار ....."

گھوڑا دھیما پڑ گیا — کھنہ صاحب کی سانس اتنے میں ہی پھول گئی تھی

"وہ لوگ دیکھو کتنی دور چلے گئے۔ اور یہ گھوڑا تمہارے ساتھ ہی چلتا ہے تمہارے بغیر چلتا ہی نہیں — !!"

"صاب — گھبراؤ نہیں — ہم پہنچ گیا ہے — بس اس چڑھائی کے بعد گلمرگ کا میدان ہے۔ ہماری پیٹھ پر بوجھ ہے۔ نہیں ہم صاب کا لگام ہاتھ میں لیکر چلتا —"

اور بڑھ کر اُس نے گھوڑے کی لگام ہاتھ میں لے لی .....

چڑھائی پار کرتے ہی کھنہ صاحب نے لمحہ بھر کے لئے حسن دین کو گہری جھیل کے باندھ جیسی اُس سرکلر روڈ پر رُک جانے کو کہا۔ سامنے دھانی گھاس کا وسیع سرسبز و شاداب طشتری جیسا گلمرگ کا میدان پھیلا تھا..... طشتری کے پھیلاؤ کی عمارت اور دُور دائیں طرف ٹکڑی کے مکانوں کی یکساں قطار اس طشتری کی وسعت کو اور بھی بڑھا رہی تھی۔

"خالصہ ہوٹل کہاں ہے۔"

حسن دین نے طشتری کے پیندے سے ذرا ہٹی ہوئی اس عمارت کی طرف اشارہ کر دیا۔

لیکن دوسرے ہی لمحہ کھنہ صاحب کی نگاہ ایک دم نزدیک بائیں طرف کے بیرک ایسے مکان کی جانب کھنچ گئی جس کے چھوٹے سے باغیچہ میں چاندی سا چوڑا۔ پایاب اور ہموار نالہ بہہ رہا تھا۔ اُس کے کنارے تپائیاں اور کرسیاں لگائے لوگ بیٹھے تھے اور ادھر ایک بڑا سا بورڈ ٹنگا تھا۔ "گلمرگ ہوٹل"

"صاحب! یہ سستا ہوٹل ہے۔ مگر اُس کا دلی میں کام کر چکا ہے کھانا صاحب کو خالصہ ہوٹل سے اچھا ملے گا ۔۔۔" کھنہ صاحب کی نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے حسن دین نے جلدی سے کہا۔

"ہم خالصہ ہوٹل میں اتریں گے!" کھنہ صاحب نے کہا۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ اُن کی بیوی اور بچہ ہوٹل کے گیٹ کے پاس رُک گئے ہیں اور قلی بستروں کو ہوٹل کی قد آدمی اونچی دیواروں سے لگائے بیڑی پی رہے ہیں ۔۔۔ اور دوسری پارٹی کے آدمی

اندر چلے گئے ہیں ـــ اور ہوٹل کے برآمدے میں کھڑے شاید کمرے ... کو دیکھ رہے تھے انہوں نے حسن دین سے چلنے کو کہا ... ۔ اور وہ سرکلر روڈ سے نیچے اُترے۔

"یہ تو بڑی خوبصورت جگہ ہے۔" نزدیک پہنچنے پر ان کی بیوی نے کہا۔ "خوبصورت ہے تو مہنگی بھی ہوگی!" کھنہ صاحب بولے ـــ "ہمیں پہلے خالصہ ہوٹل جاکر وہاں کمروں کا ریٹ لینا چاہیئے۔"

"صاحب آپ کو صرف ایک دن رہنا ہے ـــ" حسن دین نے کہنا چاہا۔ "چاہے ایک گھنٹہ کے لئے رہنا ہو ـــ جب پیسہ دینا تو پیسے کا دام لینا" انہوں نے وزر سے چڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ پھر بولے ـــ "یوں ہم ہزاروں لا خرچ کرتے ہیں لیکن جو خرچ کرتے ہیں اُس کا دام بھی وصول کرتے ہیں۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔!"

اور سچ مچ یہ بات حسن دین کی سمجھ میں نہیں آئی۔

لیکن کھنہ صاحب آگے نہیں بڑھے۔ ہوا یہ کہ کمرہ طے کرکے ادھیڑ عمر کے وہ صاحب باہر آئے اور انہوں نے قلیوں سے سامان اندر لے چلنے کو کہا۔

"کیوں صاحب ـــ! کمرہ طے کرلیا ـــ!" کھنہ صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں ـــ! یہ اوشا بابا رشی جانا چاہتی ہے۔ اگر وہاں چلنا ہے تو کچھ کھانا وانا تیار کرنا ہوگا۔ ہم لوگوں کے رہنے کے لائق یہی دو ہوٹل ہیں۔ اور یہ خالصہ ہوٹل سے مہنگا نہیں ـــ"

کھنہ صاحب ہوٹل کے سامنے مسلسل سرکتی چادر کی مانند بہتے اس جھیلم کو دیکھ رہے تھے۔ اُنہیں شاید وہ بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ تو بھی انہوں نے کہا۔ "ہم نے سنا ہے بازار میں بھی کچھ رہائش کا انتظام ہے۔"

"وہ صاحب بولے ـــ" "نیچے کے ہر دو ایک سکھوں کے ڈھابے ہیں۔"

ڈھابے کا دھواں اوبر کمرے میں بھر جاتا ہے۔ بھوت کے ڈھابے نما ہوٹل کی طرح میں نو بھوت ہیں بھی ریسٹ ہاؤس کے خیمے میں رہا تھا۔ ہمارے لئے وہاں رات کاٹنا مشکل ہے پھر اوشا آج بابا رشی دیکھنا چاہتی ہے۔ دن بھر اگر کمرہ دیکھنے ہی میں گزار دیں تو وہاں کب جائیں گے۔!"

اور وہ قلیوں کے پیچھے پیچھے چل دیئے ...

کھنہ صاحب تذبذب میں رُکے رہے۔ پھر انہوں نے حسن دین سے کہا — "بابا رشی تو ہم بھی جانا چاہتے ہیں۔ لیکن بتا دوسرا ہوٹل دیکھے ہم یہاں نہیں ٹھہرنا چاہتے۔!"

"صاب — ! گھوڑا یہیں چھوڑ کر تم کمرہ دیکھ لو —!" حسن دین نے جواب دیا — خالصہ ہوٹل سے مہنگا نہیں۔ پسند نہ آیا تو خالصہ ہوٹل چلے گا۔"

من ہی من اُس نے دُعا کی — "یا خدا —! انہیں یہیں ٹھہرا — یہاں ٹھہریں گے تو شاید الپتھر تک جائیں — نہیں تو شاید دونالہ بھی نہ جائیں گے"

کھنہ صاحب کو اُس کی بات پسند آئی۔ بیوی اور بچوں کو گھوڑے پر بیٹھے رہنے کا حکم دے کر وہ حسن دین کی مدد سے نیچے اُترے اور ہوٹل کے گیٹ سے اندر بڑھے حسن دین نے کمبل کی گانٹھ کھول کر اٹیچی کیس اور ہینڈ بیگ کو ہوٹل کی چاردیواری کے ساتھ ٹکا دیا.... اور کمبل کو لپٹتا ہوا کھنہ صاحب کے پیچھے بھاگا —

چھوٹے سے باغیچہ میں سے ہوتے، نالے پر بنے لکڑی کے پُل کو پار کرتے اور ایک نظر نالے کی پایاب لیکن ہموار تہ میں بکھری بجری پر ڈالتے ہوئے (جس کی وجہ سے وہ سرکتی چادر سا لگتا تھا) دونوں ہوٹل کے برآمدے میں گئے اور حسن دین بھاگ کر بیرے کو بُلا لایا۔

نالے کے پار سامنے برآمدے ہی میں تین اور چار نمبر کے کمرے خالی تھے۔ کھنہ صاحب نے پہلے تین نمبر کا کمرہ دیکھا ــــ لکڑی کے فرش پر میلی سی دری بچھی تھی اور انگیٹھی کے نیچے چارپائی پڑی تھی ــــ ایک چارپائی ادھر دیوار سے لگی تھی ۔ ایک چھوٹی سی میز کرسی بھی تھی۔ کمرہ بہت بڑا نہیں تھا۔ باتھ روم ساتھ ہی تھا اور اس کا بھی فرش لکڑی کا تھا ــــ باہر کے کمرے سے وہ بڑا تھا یا خالی تھا اس لئے بڑا لگتا تھا۔

چار نمبر کمرہ اور باتھ روم دونوں چھوٹے تھے.... چارپائی وہاں ایک ہی آسکتی تھی ..... تین نمبر کا چار اور چار نمبر کا تین روپے روز کرایہ ہوٹل کے بیرے نے بتایا ــــ

کھنہ صاحب مطمئن ہوئے، کیونکہ اُن کے دوست نے سری نگر میں ہی بتلایا تھا کہ خالصہ ہوٹل میں کمرہ تین چار روپے روز پر مل جائے گا۔ لیکن منہ مانگے دام دیے دینا اُن کی کاروباری ذہنیت کو قبول نہیں تھا۔ اسی لئے انہوں نے چار روپے والے دو اور تین روپے والے کا ایک ایک روپیہ کہا ۔

بیرے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حقارت کی ایک نظر اُن پر ڈالتا ہوا وہ چلا گیا ۔

"یہ کیسی دولت مند سواری ہے ــ ؟" لحظہ بھر کے لئے حسن دین کے من میں خیال گزرا ۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُس نے دل کو سمجھایا کہ "انگریزوں کا وقت نہیں رہا ۔ ہندوستان آزاد ہو گیا تو کیا ہوا ۔ ہندوستانیوں کی غلامانہ ذہنیت نہیں گئی ۔ بڑے سے بڑا امیر آدمی بھی بھاؤ تاؤ کرنا نہیں بھولتا ــ " یہ بات وہ گذشتہ دو تین برس کے تجربے ہی سے جان گیا تھا ــ اس لئے اُن کی اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس نے اُنہیں سمجھایا کہ چاہے وہ گھنٹوں سارے گلمرگ میں

مارے مارے پھریں۔ اس کرائے پر انہیں کمرہ نہیں ملیگا ـــ ڈھابے کے اوپر شاید دو روپے میں مل جاتے ـــ لیکن وہاں رہنے پر میم صاحب اور بچے کو تکلیف ہوگی۔ باتھ روم وہاں ہے نہیں اور سخت سردی میں باہر جانا پڑے گا۔ "صاحب ہم اس کو بولتا ہے شاید وہ چار روپے کے بدلے میں تین اور تین کے بدلے دو مان جائے۔" اُس نے کھنّہ صاحب سے کہا۔

بیرے کی اس حقارت بھری نظر سے کھنّہ صاحب خود سٹپٹا گئے تھے ـــ اس لئے جب حسن دین نے انہیں سمجھایا تو وہ فوراً مان گئے۔

یوں سیٹھ کو منا کر حسن دین بیرے کے پاس گیا اور اس نے اُسے منا لیا۔
"کس کمرے میں سامان رکھے گا صاحب ـــ ؟" آکر اس نے کھنّہ صاحب سے پوچھا۔

"چار نمبر میں ـــ ؟"

"صاحب اس میں ایک ہی پلنگ ہے۔ میم صاحبہ اور بچّے کو تکلیف ہوگا" حسن دین کی آنکھوں میں استعجاب کے جو تاثرات تھے وہ اُن سے چھپے نہیں رہے ـــ برآمدے سے ایک کرسی گھسیٹ کر نالے کے کنارے رکھتے اور اس پر دھپ سے بیٹھتے ہوئے بڑی بے پرواہی سے انہوں نے کہا ـــ "ارے بھائی ـــ ہم کو پلنگ ونگ کی کیا ضرورت ہے۔ پہاڑ پر آنے کو ہم لمبی پکنک سمجھتے ہیں۔ ہم پہاڑ پر جاتے ہیں تو ہمیشہ زمین پر سوتے ہیں ـــ!"

"لیکن صاحب، یہاں ٹھنڈک ہے۔ بچّے کو سردی لگ جائے گا۔"
کھنّہ صاحب اُس سے ہزاروں روپیہ خرچ کرنے کی بات کہہ چکے تھے۔ اسی لحظہ بیرا بھی وہاں آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں اُن کے تئیں نفرت کا جو جذبہ تھا کھنّہ صاحب اُسے جھٹلا دینا چاہتے تھے۔ اسی لئے اُسی شاہانہ بے پرواہی سے انہوں نے

کہا ــــــ " ارے بھائی تو تین نمبر کمرہ لے لو ـــ! کیا فرق پڑتا ہے۔ صبیح صاحب اور بچے کو جاکر لے آؤ۔ ہم یہیں بیٹھتے ہیں۔"

حسن دین بیرے سے بات کرکے باہر بھاگ گیا اور دوسرے لمحہ کھنہ صاحب کی شریمتی اور بچے کے ساتھ سامان کے آگے آگے آگئیں۔

" تین نمبر کا کمرہ لیا ہے ـــ!" کھنہ صاحب نے بیٹھے بیٹھے کہا ـــ اور زور سے انگڑائی لی۔

اپنی سلطنت میں داخل ہونے والی ملکہ کی طرح کھنہ صاحب کی بیوی اُس کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے حسن دین کو حکم دیا کہ وہ قلیوں سے سامان اُتروائے پھر وہ کھٹ کھٹ کرکے باہر آئی اور اُس نے کھنہ صاحب سے پوچھا۔

" کتنا کرایہ ہے روز کا ـــ"

" تین روپے ـــ"

" سستا نہیں تھا ـــ!"

" چار نمبر کا کمرہ دو روپے میں ہی ملتا تھا۔ لیکن وہاں دو چارپائیاں نہیں آسکتیں۔ زمین پر سونا پڑتا۔!"

" سو لیتے ـــ پہاڑ پر آکر بھی چارپائیوں پر سوئے تو سیر کا مزا کیا رہا ـــ؟"

" یہاں زیادہ ٹھنڈک ہے اور پھر بچہ ساتھ ہے۔ رسک (RISK) نہیں لینا چاہیئے ـــ" اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے برآمدے کی طرف دیکھا کہ کہیں حسن دین نے اُن کی باتیں تو نہیں سُن لیں۔

کھنہ صاحب کی بیوی واپس چلی گئی اور وہ نالے کے اُس پھسلتی سی چادر کو دیکھنے لگے۔ دوسرے لمحہ اُن کا بچہ اُن کے پاس آپہنچا۔

نقلی سامان کمرے میں چھوڑ کر، میم صاحبہ کے حکم کے مطابق بستر کھول کر اور انہیں چارپائیوں پر بچھا کر آ گئے تھے۔ کھنہ صاحب نے انہیں رخصت کیا۔ حسن دین قدرے فاصلہ پر چپ چاپ کھڑا ہوا کہ صاحب اُدھر دھیان دیں تو یاترا کا پروگرام طے کرے۔۔۔۔

"بابوجی یہاں فوٹو نہیں لیں گے۔" بچے نے کہا

"ضرور لیں گے۔!" بابوجی بولے۔ "ذرا تمہاری ممی آ جاتی۔!"

بچہ اُس کا اور اُن ادھیڑ عمر والے صاحب سے جا ملا جو برآمدے میں اپنے کمرے کے باہر کھڑے تھے اُنہیں گھسیٹتا ہوا وہ اپنے پاپا کے پاس لے آیا۔

"آئیے صاحب آئیے۔ آئیے۔ بیٹھئے۔!"

اور کھنہ صاحب دوسری کرسی گھسیٹ کر وہاں لے آئے۔

تب باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اُن ادھیڑ عمر والے صاحب کا نام گیان چند ہے۔ دلی کے ایک کالج میں پروفیسر ہیں۔ ساتھ میں اُن کی بھتیجی ہے (کھنہ صاحب نے اُسے اُن کے بڑھاپے میں نئی شادی شدہ بیوی سمجھا تھا۔ کیونکہ اُس کی عمر تیس بتیس کی ضرور تھی) بی۔ اے ہے۔ اُس کی طبیعت ضرور کچھ خراب ہو گئی ہے اس لئے اُسے لے آئے ہیں۔

کھنہ صاحب نے اپنا تعارف کرایا اور پوچھا۔ "کونسا سبجیکٹ پڑھاتے ہیں آپ۔"

انہوں نے بتایا کہ انہوں نے تاریخ اور اقتصادیات میں ایم اے کیا ہے اور اقتصادیات میں ڈاکٹریٹ لی ہے۔ پڑھاتے وہ اقتصادیات ہیں لیکن ضرورت پڑنے پر تاریخ کی کلاس بھی لے لیتے ہیں۔

"یہ لڑکا آپ کا رشتہ دار ہے کیا۔!"

"نہیں ۔۔۔ یہ بھی کشمیر دیکھنے آیا ہے ۔۔ بڑا بھلا لڑکا ہے ۔ اکیلا تھا ہم نے ساتھ مل کر ہاؤس بوٹ لے لیا ۔ اس لئے یہ ہمارے ساتھ گھر تک آ گیا۔" اور کچھ رُک کر انہوں نے پوچھا ۔ "آپ چل رہے ہیں بابا رشی؟"

"ارادہ تو ہے ۔"

"کھانا کھا کر چلیں گے یا وہاں چل کر کھائیں گے ! سُنا ہے لالہ رشی کی سمادھی سے ذرا اِدھر جھرنا بہتا ہے ۔ اسی کے کنارے کھانا کھائیں ۔ ڈکی ساتھ لے چلیں گے ۔۔!"

"جیسی آپ کی مرضی ۔۔۔!"

"تو میں کچھ سینڈوچ تیار کرا لوں ۔۔ آپ ۔۔۔۔"

"ہماری فکر نہ کیجئے ۔ ڈن تو ہم نے نگر میں کافی ناشتہ کر لیا تھا ۔ پھر ہم ساتھ پراٹھے لائے ہیں ۔۔۔۔"

مسٹر اُپل چلے گئے ۔ کھنہ صاحب نے دیکھا حسن دین اُن کی بات سن رہا ہے انہوں نے اپنا رُخ اُس کی طرف موڑ دیا ۔

"۔۔۔۔۔ یہ سینڈوچ ، فینڈوچ ہم سے نہیں کھائی جاتی ۔۔۔ کہاں خالص گھی میں تر پراٹھے ۔ اور کہاں یہ بیدے کی سینڈوچیں ۔۔۔!" اور وہ خود ہنسے ۔

حسن دین نے ہمیشہ انگریزوں کو لذت بائیبر کی سینڈوچ پکنک پید ساتھ لے جاتے دیکھا تھا ۔۔۔ اُسے خود بھی انھیں کھانے کا موقع ملا تھا ۔۔۔ اندر سے وہ موٹے چاولوں یا مکئی کی روٹی اور سیکھ کے مقابلے میں وہ اُسے اچھی بھی لگی تھیں لیکن کھنہ صاحب کو ہنستے دیکھ کر وہ بھی ساتھ دینے کے لئے ہنس دیا ۔ دل ہی دل میں اُس نے بابا رشی کے حضور میں سر جھکا دیا ۔ جنہوں نے اُس کے دل کی مراد پوری کی تھی ۔

پھر وہ باہر نکلے اور منّو کو باہر ٹھہرے رہنے کو کہا گیا کہ صاحب ابھی "بابا ریشی" دیکھنے چلیں گے ۔

جب وہ لوگ ... بابا ریشی کے لیے چلنے لگے تو اپل صاحب نے یکایک اوشا سے کہا کہ ایک دری لے لے

"صاحب، تم بھی ایک دری لے لو ....!" حسن دین نے کھنہ صاحب کو صلاح دی ۔

"کیوں ؟"

"صاحب، بیٹھنے کو، کھانا وغیرہ کھانے کو، میم صاحب اور بچے کے آرام کرنے کو ....."

"وہاں گھاس نہیں ہے ...؟"

"ہے صاحب !"

"تو پھر چلو ... ان نزاکتوں اور نفاستوں کے ہم قائل نہیں ... گھر میں چاہے گدیوں اور گدیلوں پر آرام کرو ۔ لیکن وقت آنے پہ سوکھی دھرتی پر سونے میں مت جھجکو ... اپنے بچے کو میں یہی سکھاتا ہوں .....!"

اپل صاحب اور ان کی پارٹی آگے نکل گئی تھی — اپنی بیوی اور بچے کو گھوڑے پر سوار کر کے کھنہ صاحب خود بھی حسن دین کی مدد سے گھوڑے پر سوار ہوئے کچھ دور میدان میں چل کر وہ بازار کے اس ... کی طرف کچھ اوپر بڑھے جسے حسن دین نے انھیں بائیں طرف دکانوں کے کھنڈر بتاتے جنھیں قبائلیوں نے لوٹ کر جلا دیا تھا اور دو تین برسوں کی مسلسل برف باری نے منہدم کر دیا تھا

"وہ پہلے کیا ... نہیں ... تھی ؟" کھنہ صاحب نے پوچھا ۔

"خوب پڑتا صاب — لیکن ہٹا دیا جاتا تھا — جب گلمرگ لٹ گیا اور لڑائی شروع ہو گئی۔ وزیٹر لوگ آنا بند ہو گیا . تو یہ سب دوکان اپنے آپ ڈھے گیا"

اور حسن دین کے سامنے وہ دن گھوم گئے۔ جب قبائلیوں کی فوج کا ایک حصہ بارہ مولے سے سری نگر کو جاتا ہوا گلمرگ کو مڑ آیا تھا۔ ٹنگمرگ اور گلمرگ پر انہوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اور گلمرگ اور ٹنگمرگ کی لوٹ سے پانچ سو ٹرک بھر کے ساتھ لے گئے تھے۔

اس سڑک نے کھنڈر بازار کے اختتام پر ایک راستہ نیچے کی طرف بابا رشی کو جاتا تھا۔ کھنہ صاحب نے حسن دین سے کہا کہ وہ لگام تھام کر ان کے ساتھ ساتھ چلے اور انہوں نے آواز دے کر عیدوا اور ممدو سے بھی کہا کہ وہ گھوڑوں کو تھام کر چلیں

"صاحب کچھ فکر نہیں — ڈھلان پر گھوڑا اترے تو پیچھے تن کر بیٹھیں!"
کھنہ صاحب پیچھے کو تن کر بیٹھ گئے۔ لیکن حسن دین نے آگے بڑھ کر لگام تھام لی۔

تب جانے کیوں کھنہ صاحب نے پھر وہی سینڈوچوں والی بات چلا دی بولے — "ہم لوگ دلی میں جب پکنک پر جاتے ہیں تو معلوم ہے ساتھ کیا لے جاتے ہیں۔"

لمحہ بھر کے لئے وہ حسن دین کا جواب سننے کے لئے رکے۔
جب حسن دین ایک بار ان کی طرف دیکھ کر بغیر جواب دیئے اسی طرح گھوڑے کی لگام تھامے چلتا رہا تو کھنہ صاحب بولے — "یہ سینڈوچ فینڈوچ جیم فیم نہیں — آلو مولی کے پراٹھے اور بڑھیا چھاچھ ہوا دہی — یا پھر

شلجم اور گوبھی کا اچار۔ — خوب گھومنے پھرنے اور دھما چوکڑی مچانے کے بعد اچار یا دہی کے ساتھ آلو کے پراٹھے کے بعد کھانے کا مزا کھانے والے ہی جان سکتے ہیں۔"

اور جیسے کھنّہ صاحب کو تخیّل ہی میں وہ مزا آنے لگا تھا۔

چند لمحہ تک چپ چاپ پیچھے کو تنے، گھوڑے پر بیٹھے چلتے رہے۔ پھر بولے "لیکن آج کے یہ بیچارے آدھے صاحب آدھے ہندوستانی لوگ کریں بھی کیا۔ ان پراٹھوں کو ہضم کرنے کے لئے آنتیں بھی تو مضبوط چاہئیں۔ پنجابی کھانے کو پنجابی ہی ہضم کر سکتے ہیں —"

حسن دین بہت سے ایسے پنجابی صاحبوں کو جانتا تھا جو انگریزوں کے زمانے میں بھی گلمرگ آتے تھے اور رہن سہن میں، کھانے پینے میں، کسی طرح انگریزوں سے کم نہ تھے — صاب اِدھر تو پنجابی لوگ انگریزوں کے مافق کھانا کھاتا اور کپڑے پہنتا ہے۔" یکایک اس نے پلٹ کر کہا۔

"اب پہننے کو تو ہم بھی پتلون کوٹ پہن لیتے ہیں —" کھنّہ صاحب بولے — "لیکن کھانا تو کھالی ہم اپنا ہی کھاتے ہیں ...... یہ اُبلا ہوا گوشت سبزی ترکاریاں بغیر نمک مرچ اور مصالحے کے — یہ بھی کوئی آدمی کا کھانا ہے — ! کہاں روسٹ مٹن اور کولڈ مٹن اور کہاں قورما اور روغن جوش۔ کہاں ڈبل روٹی کی سلائس اور کہاں گھی میں رچے ہوئے پراٹھے اور پھر کھالی یہ پتلون کوٹ بھی ہم باہر ہی پہنتے ہیں۔ یہاں گھوڑوں پر جگہ جگہ گھومنا پڑتا ہے اس کے لئے یہی لباس اچھا ہے۔ لیکن بیچ تو ہم تہمد کے سوا اور کچھ نہیں پہنتے — جو مزا لمبے کرتے اور تہمد میں ہے وہ سالا ان کوٹ پتلونوں میں کیا ہوگا — یہ گلے میں سلک کا لمبا کرتہ۔ کمر میں ملاک کا لمبا تہمد اور پاؤں میں کالے کا جوتہ — لگتا ہے جیسے آدمی کو پنکھے لگ گئے

ہوں ۔۔۔ پنجابیوں کی صحت کا راز اِسی کھُلے کھانے پینے اور کھلے رہنے سہنے میں ہے ۔۔ "

اب حسن دین کو کہنے کے لئے کچھ بات ملی ۔ ہنستے ہوئے بولا ۔

"دلون صاب ۔۔! پنجابی لوگ کی کیا بات ہے ۔ خوب کھانے پینے اور موج اُڑانے والا آدمی ہے ۔ پانچ چھ سال پہلے کی بات ہے ۔ ایک پنجابی صاب ہر سال گلمرگ آتا تھا ۔ یہیں نیبڈو میں ٹھہرتا تھا ۔ آتے ہی ہم کو خبر دیتا تھا کہ حسن دین اپنا گھوڑا لے کر آؤ ۔ وہ ہمارے گھوڑے کے سوا دوسرے پر چڑھتا نہیں تھا ۔۔ ایک بار صاب ہم اُس کو لینٹھر لے گیا ۔ اُدھر اوپر ٹپ پر طوفان آیا ۔ برف گاڑی کوئی تھی نہیں ۔۔ صاب ۔۔! ہم نیچے موم جامہ بچھا کر آگے بیٹھا صاب کو ہم نے پیچھے بٹھایا اور ہم برف گاڑی کی طرح پھسلتا صاب کو نیچے لے آیا ۔۔ صاب اتنا خوش ہوا کہ اُس نے ہم کو دس روپے انعام دیا ۔۔ بخششیں دینے میں وہ کسی انگریز سے کم نہ تھا ۔۔ "

"ارے پنجابیوں کی کیا بات ہے ۔۔! " کھنہ صاحب نے دائیں ہاتھ سے ہوا کو چیرتے ہوئے کہا ۔۔ "دل کے تو دریا ہوتے ہیں دریا ۔۔ " اور انہوں نے اپنی دریا دلی کا ایک قصہ سنانا شروع کیا کہ کس طرح پچھلے اتوار انہوں نے ڈل کی سیر کرنے کے لئے دن بھر کے لئے ایک شکارہ کیا ۔ شالامار ، نشاط ، چشمہ شاہی دیکھتے ہوئے واپس پہ نہرو پارک ٹرک کہ امیرا کدل آنے کا پروگرام تھا وہیں ایک ظروس بوٹ میں وہ ٹھہرے تھے ۔ شکارے والا تیرہ روپے مانگتا تھا دس روپے میں فیصلہ ہوا ۔ لیکن جب وہ واپس آئے تو انہوں نے اُسے بندرہ روپے دیئے ۔

اور یہ قصہ سناتے ہوئے اُن کے چہرے پر کچھ عجیب سی مسرت بھری چمک

آ گئی۔

"لیکن وہ پنجابی صاحب کبھی مول بھاؤ نہیں کرتا تھا۔" حسن دین نے گھوڑے کو ایک نالے سے بچا کر نکالتے ہوئے کہا۔

لحظہ بھر کے لئے کھنہ صاحب کے چہرے کی ساری مسرت ہوا ہو گئی — لیکن جب گھوڑا باآسانی اُس نالے کو پار کر گیا تو وہ بولے۔ "ہم بھائی کاروباری آدمی ہیں۔ مول بھاؤ کئے بغیر تو ہم ایک قدم نہیں چل سکتے۔ اور ہمارا یقین ہے کہ حساب ماں بیٹی کا اور بخشش لاکھ ٹکے کی۔"

اور جیسے اس بات سے انہوں نے حسن دین کی بات کو کاٹ دیا ہو — !
وہ پھر مسرت سے کھل اُٹھے — حسن دین نے بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملائی —

"ہاں صاب! یہ بات تم نے خوب بولا ہے!"

اور کھنہ صاحب خوش ہو کر اپنے دادا کا قصہ سنانے لگے کہ وہ کتنے دریا دل تھے۔ کوڑی کوڑی جوڑ کر انہوں نے لاکھوں روپے پیدا کئے۔ بھاری کاروبار پھیلایا۔ لیکن ایک دن بات آ پڑی تو انہوں نے ساری زندگی کی کمائی آن واحد میں دان کر دی۔

حسن دین ایسے حاتم طائی کی کہانی سننے کو بے قرار تھا کہ اچانک کھنہ صاحب نے دیکھا کہ اُن کے لڑکے کا گھوڑا دوڑنے لگا ہے اور ککو لگام کھینچنے کے بجائے اُسے ڈھیلا چھوڑے گھوڑے کو ایڑ لگا رہا ہے اور وہ خوفزدہ ہو کر چلا اُٹھے اور اگرچہ حسن دین نے انھیں یقین دلایا کہ گھوڑا گرائے گا نہیں — لیکن کھنہ صاحب نے اُسے ککو کے گھوڑے کے پیچھے دوڑا دیا کہ اُسے روکے اور شبدو کو ہدایت دے کہ گھوڑے کی لگام نہ چھوڑے

بابا بام دین کے مزار پر پہنچ کر حسن دین نے چھوٹے سے بازار کے سرے پر گھوڑے روک دیئے اور لکھنہ صاحب کو سہارا دے کر اتارا اور اشارہ کرتے ہوئے کہا :-

"صاحب "بابا رشی کی زیارت گاہ اُس طرف ہے ۔ گھوڑا یہیں تمہارا انتظار کرے گا — پہلے تم رشی کا درشن کرے گا ! لنچ کھائے گا ؟ تمہارا ساتھی لوگ تو وہ دیکھو اُدھر جا رہا ہے — ڈھلان پر شاید آرام کرے گا ۔"

"نہیں ہم لوگ پہلے بابا رشی کے درشن کریں گے ۔" لکھنہ صاحب نے جواب دیا ۔

لیکن اُن کا لڑکا گھوڑے سے اترتے ہی بھاگ کر ایک دکان پر پہنچ گیا تھا اور ہرے منکوں کی مالا لینے کے لئے ضد کر رہا تھا ۔

لکھنہ صاحب اور اُن کے پیچھے پیچھے حسن دین دکان پر پہنچے ۔

"ارے یہ تو لڑکیوں والی مالا ہے ۔ تم لڑکی ہو یا لڑکا ؟" لکھنہ صاحب نے بچے کو کھینچتے ہوئے کہا ۔

چھوٹا سا بازار تھا ۔ دو تین دوکانیں تھیں جن میں کشمیریوں کی ضرورت کا سامان تھا ۔ چاول ۔ آٹا ۔ دال ، نمک ، ماچس ، سیگرٹ ، پان ۔ دودھ ، روٹی سوائن ، سبز چائے ۔ بیڑی ، چار مینار اور سستے سیگرٹوں کی ڈبیاں ۔ مٹی کا تیل ۔ کچھ سستے کپڑے ۔ ٹوپیاں وغیرہ ...... وزیٹروں کے لئے تو سوائے رنگ برنگے پتھروں کی مالاؤں اور چاندی کے دکھائی دینے والے لیکن حقیقتاً گلٹ کے گہنوں کے

اور کچھ نہ تھا۔

"ارے صاحبا! لے دو بچے کو مالا ۔۔۔!" حسن دین نے عقب سے

کھنہ صاحب نے ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا ۔ "او دیکھو تو کو۔ حسن دین جلیبی لڑکی بنانے کو کہتا ہے ۔۔!"

تب لڑکا قلی جیسی ٹوپی لینے کی ضد کرنے لگا۔

کھنہ صاحب اور بھی زور سے ہنسے ۔ "یہ تو کشمیری سائیس کی ٹوپی ہے ۔۔۔ یہ دیکھو حسن دین نے پہن رکھی ہے۔ تم کیا یہ تو پہنو گے ۔۔۔؟"

اس وقت مسز کھنہ نے پیچھے سے آکر لڑکے کا ہاتھ کھینچا۔

"چلو ۔۔۔! پہلے ہی دیر ہو گئی ہے ۔۔۔!" بابا رشی کے درشن کر کے کھانا کھائیں گے۔ پھر جو چاہو گے لے دیں گے ۔۔۔!"

ان کی بیوی بچے کا ہاتھ پکڑے آگے آگے چلی تو کھنہ صاحب بھی ہنستے ہوئے پیچھے چلے۔ بچہ ضد کر رہا تھا۔ اُن کی بیوی سمجھاتی ہوئی اُسے زبردستی لئے جا رہی تھی اور حسن دین سوچ رہا تھا ۔۔۔ "اگر صاحب بچے کو ٹوپی لے دیتا تو کیا بگڑ جاتا۔۔؟ کہا مالا پہننے سے وہ لڑکی اور ٹوپی پہننے سے سائیس بن جائے گا۔۔ یہ صاحب کیسا ہے جو روپیہ آنکھ آنکھ کے لئے بچے کو رلا رہا ہے۔۔۔۔۔!"

"حسن دین چلو تم آگے آگے ۔۔۔!" اچانک کھنہ صاحب نے اُس کے خیالات کا سلسلہ توڑتے ہوئے کہا۔

جمیلہ اور منظور کو وہیں آرام کرنے کے لئے کہہ کر وہ اُن کے آگے آگے ہو لیا۔ بابا رشی کا مزار بازار سے ذرا دور تھا۔ بیچ میں باہر سے آنے والے عقیدت مندوں اور زیارتگاہ کے خدمتگاروں کے لئے جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس وقت بھی

وہاں کوئی کشمیری خاندان ٹھہرا ہوا تھا۔ کوٹھریوں کے باہر کھلے میدان میں دیگ چڑھی تھی۔ اور اُس کے اِس گرد کشمیری عورتوں کا جھنڈ بابا رشی کی تعریف کی تعریف و توصیف کے گیت گا رہا تھا۔ حسن دین اُن کے پاس سے گزرتا ہوا کھنہ صاحب کو مزار تک لے گیا۔

" اس کی چھت شاہ ہمدان کے مقبرے جیسی بنی ہے۔ !" مقبرے کے باہر لحہ بھر کو رُک کر کھنہ صاحب نے اپنی بیوی کو سمجھایا۔

مقبرے کے چھوٹے سے دروازے پر رنگین پردہ پڑا ہوا تھا۔ اُن کے پہنچتے ہی مجاور نے پردہ ہٹا دیا۔ اندر بڑا سا چوکور کمرہ تھا۔ جس کے بیچوں بیچ بابا رشی کی قبر تھی۔ حسن دین نے اندر داخل ہوتے ہی بابا رشی کے حضور میں سر جھکا دیا۔ کھنہ صاحب اُن کی بیوی، اور بیٹے نے اس کی نقل کی۔ پھر حسن دین کے پیچھے پیچھے انہوں نے قبر کا طواف کیا۔ زیارت گاہ لکڑی کی بنی تھی اور اس کی دیواروں میں ہوا کے لئے بڑی خوبصورت جھلملی جالیاں بنی تھیں۔ یکایک کھنہ صاحب نے رُک کر پوچھا۔

" حسن دین! یہ جھلملی میں تاگے اور بال کیسے بندھے ہیں۔ ؟"

حسن دین نے اُن بندھے ہوئے تاگوں اور بالوں کی لٹوں کی اہمیت انہیں سمجھائی اور کہا — " صاحب — تم بھی منت مانو — بابا رشی ضرور بر ضرور پورا کریگا"

تب کھنہ صاحب نے تاگا اور اُن کی بیوی نے بالوں کی لٹ جھلملی میں باندھ کر منت مانی۔ کھنہ صاحب نے چاہا انہیں ماسٹری کا ٹھیکہ مل جائے..... اور کھنہ صاحب کی بیوی نے دوسرے بیٹے کی خواہش کی۔ گگو دس برس کا تھا اور اس کے بعد اس کے دوسرا بچہ نہ ہوا تھا۔

منت مان کر دونوں نے بابا کے حضور میں سجدہ کیا اور ایک بار پھر طواف کر کے باہر نکل آئے

مجاور بڑی تیز نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"صاب — یہاں کچھ خیرات کرنا چاہیئے۔" حسن دین نے انہیں سمجھایا
کھنہ صاحب نے جیبیں ٹٹولیں۔ پھر مجاور سے بولے۔ "میری جیب میں
ریزگاری نہیں۔ دس دس کے نوٹ ہیں۔ ہم بابا رشی کی خدمت میں پھر حاضر ہوں گے
اور اگر ہمارے دل کی مراد پوری ہوگئی تو بابا کو خوب خوش کر دیں گے۔" (رشوت
کی اس زبان کے علاوہ وہ دوسری زبان جانتے ہی نہ تھے۔)

مجاور نے ہنس کر دعا دی کہ اُن کے دل کی مراد بر آئے — اور پھر وہ وہاں
تشریف لائیں۔ اور کھنہ صاحب اور اُن کی دیکھا دیکھی اُن کی بیوی بچے نے ہاتھ جوڑے
اور وہ واپس پھرے۔

کھنہ صاحب نے اپنی بیوی کو انگریزی میں سمجھایا کہ جب تک مراد پوری نہ
ہو جائے وہ خیرات کرنے میں یقین نہیں رکھتے اور چلتے چلتے وہ خود اعتمادی سے
ہنس دیئے۔

لیکن حسن دین کو اُن کا بابا رشی کے مزار پر کچھ بھی خیرات نہ کرنا اچھا نہیں لگا
وہ کہنا چاہتا تھا — "صاب! ہم ایک دو روپیہ دے دیں —" لیکن صاحب
بُرا نہ مان جائے اس خوف سے وہ چُپ رہا۔ ہاں اُس نے یہ کیا کہ جیب سے دو آنے
کے پیسے نکال بابا کی چوکھٹ پر رکھ کر سجدہ کر دیا اور بھاگ کر اُن سے جا ملا۔

بازار کے قریب پہنچ کر کھنہ صاحب نے کہا: "حسن دین — اب ہم کھانا کھائیں
گے .... اور کچھ آرام کریں ..... تم بھی چائے وائے پی لو — اور آرام کر لو۔ دو
گھنٹے بعد ہم چلیں گے۔"

اور یہ کہہ کر انہوں نے کینوس کا بیگ اُٹھایا۔
حسن دین نے بڑھ کر بیگ اُن سے لے لیا۔
کھنہ صاحب آگے چلتے ہوئے بولے۔ "چشمہ کدھر ہے؟ ہم وہیں چلیں گے

"تاکہ پانی کی دقت نہ ہو۔"

"پانی کا فکر صاب تم مت کرو۔ پانی ہم لائے گا۔ تم اُدھر گھاس پر بیٹھو۔" پھر کھنہ صاحب کو تھوڑا سا رُک کر اُس نے کہا۔ "صاب ہم کو کچھ مل جاتا تو ہم اُن لوگوں کا چائے پانی کا انتظام کر دیتا۔"

کھنہ صاحب نے بے پرواہی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک دس کا نوٹ نکالا — "میں بھول گیا ریزگاری لے کر چلنا — میرے پاس دس دس کے نوٹ ہیں۔ اسی لئے بابا رتی سے اُدھار کر لیا۔"

اور وہ ہنسے

نوٹ دیکھ کر حسن دین نے کہا — "صاب — ایک روپیہ مل جاتا تو ہمارا کام چل جاتا۔"

کھنہ صاحب پھر ہنسے — "چلتے وقت میں نوٹ تڑوانا بھول گیا —" پھر قدرے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔ "یہیں کہیں نوٹ ٹوٹ جائے گا —؟"

"صاب — دس کا نوٹ یہاں کون توڑے گا —؟"

کھنہ صاحب نے ڈرامائی انداز سے نوٹ آگے بڑھایا — "تم یہ لو، تمہارا تو کافی پیسہ ہمیں دینا ہے۔"

حسن دین جانتا تھا کہ کل کھنہ جی بھی اُسی کے گھوڑے پر جائیں۔ بولا — "نہیں صاب، رہنے دو — ہم اپنے پاس سے خرچ کر لینا ہے — دس روپیہ ہم کیا کرے گا؟"

کھنہ صاحب نے فوراً جیب میں رکھ لیا اور بڑی بے پرواہی سے بولے:—

"ٹھیک ہے — تم اپنے پاس سے خرچ کر لو۔ پھر حساب ہو جائے گا۔"

"صاب — تم چلو بیٹھو — ہم اُن لوگوں کو کچھ پیسہ دے کر دو منٹ

میں آتا ہے ۔ !"

اور حسن وہیں کھڑا گا ۔ اُس نے ممدو کو آٹھ آنے دیئے اور کہا کہ صاحب کے پاس تو دس کا نوٹ ہے۔ ابھی کچھ بخشش نہیں ملی یہ آٹھ آنے لے کر وہ کچھ کھانے پینے کا سامان لے آئے اور وہ دونوں چائے بنوا کر پئیں ۔ وہ صاحب لوگ کو کھانا کھلا کر آتا ہے ۔ اور وہ چلا گیا ۔

کھنہ صاحب اُس کے انتظار میں رُکے تھے ۔ اُن کی بیوی ذرا فاصلہ پر رُکی اُن دونوں کا انتظار کر رہی تھی ۔ لیکن بچہ بھاگ کر اُپل صاحب کے پاس چلا گیا تھا کھنہ صاحب اپنی بیوی کے ساتھ اِس طرح چلے جیسے اُن کا ارادہ اُپل صاحب سے قدرے فاصلہ پر اڈہ جمانے کا ہو۔ تبھی اُن کا بچہ وہیں سے آواز دینے لگا ۔ "بابو جی ۔ ادھر آیئے ۔"

"ادھر آؤ ! ہم اُدھر بیٹھیں گے ۔ !" انہوں نے مصنوعی غصہ سے کہا ۔

بچہ وہیں مچلنے لگا ۔ تب اُپل صاحب نے آواز دی ۔ "ادھر آ جایئے صاحب"

کھنہ صاحب جیسے با دلِ ناخواستہ ادھر کو چلے۔ اُپل صاحب ۔ اُن کی بھتیجی اور وہ نوجوان جیم وغیرہ کے ڈبے کھولے کھانا کھا رہے تھے ۔ کھنہ صاحب کا لڑکا بے تکلف ان لوگوں کے ساتھ سینڈوچ اُڑا رہا تھا ۔

"آیئے صاحب ۔ نوش فرمایئے !!"

"ہم تو پراٹھے لائے ہیں ۔ !"

"یہ پراٹھے بھی کھایئے اور یہ بھی لیجئے ۔ ہمارا تو پیٹ ہی ٹھیک نہیں رہتا۔ ورنہ یہ پراٹھے بھی میری کمزوری رہے ہیں ۔ اُوشا آپ کا ساتھ دے گی ۔ ۔"

اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے بڑے اطمینان سے ایک سینڈوچ کو جیم لگا کر اُسے دانتوں میں رکھا۔

کھنہ صاحب نے حسن دین سے بیگ لے کر اُس میں سے پراٹھوں کا ڈبّہ نکالا اور ایک ایک انہوں نے سب کے آگے بڑھا دیا۔ اُپل صاحب تو پہلے ہی اپنے معدے کی شکایت کر چکے تھے۔ اُن کی بھتیجی نے باسی پراٹھا دیکھ کر ایسے مُنھ بنایا کہ اُپل صاحب کو آنکھ سے اُسے ظاہری وضعداری بنائے رکھنے کا اشارہ کرنا پڑا۔ اس اشارے کی وجہ سے افریقی نوجوان نے پراٹھے کا ایک ٹکڑا توڑ کر مُنھ میں رکھ لیا اور اُس کی تعریف بھی کی۔

"ذرا دہی اور شلجم کے اچار کے ساتھ کھائیے۔" کھنہ صاحب خوش ہو کر بولے "کچھ ٹھنڈے سے ہو گئے ہیں۔ گرم گرم توے سے اُتریں تو انگلیاں چاٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔" اور پراٹھوں کی تعریف کرتے اور اُدشا اور اس افریقی نوجوان کو ایک دو نقمے اور کھانے کا اصرار کرتے ہوئے وہ بڑی بے تکلفی سے سینڈوچ کے لفافے پر ہاتھ صاف کرتے گئے۔

حسن دین کافی دیر سے ذرا سے فاصلہ پر چپ چاپ کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ پراٹھوں کا ڈبّہ خالی کر کے کھنہ صاحب نے اُسے دیا کہ مٹی سے مانجھ دھو کر اُس میں پانی بھر لائے۔

شریمتی کھنہ نے کہا کہ وہ بھر لائیں گی۔ لیکن کھنہ صاحب نے کہا "نہیں وہ بھر لائے گا۔ تم بیٹھو۔" حسن دین پانی بھر لایا تو بچے نے اس سے ڈبّہ چھین لیا۔ شریمتی کھنہ چشمہ دیکھنے کے بہانے اُٹھ گئیں اور انہوں نے وہاں چشمہ پر جا کر پہلے پانی پیا پھر کلّہ کر کے منھ ہاتھ دھویا۔

جب ککو پانی پی چکا تو کھنہ صاحب نے ایک ہی سانس میں ڈبہ خالی کر دیا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ لیکن وہ زیادہ کھا گئے تھے اور انہیں بڑی پیاس لگ آئی تھی۔ جی بھر کے پانی پینے کے بعد انہوں نے زور کی ڈکار لی اور نیم دراز ہو گئے۔ تب انہوں نے

پروفیسر صاحب نے پوچھا کہ وہ بابا رشی کا مزار دیکھنے کیوں نہیں گئے اور انہوں نے حسن دین سے سُنے بابا رشی کے معجزوں کی کہانی سُنا دی۔

"ہمیں اِن رشیوں وشیوں میں کوئی اعتقاد نہیں۔" اُپل صاحب بولے۔

"اوشا دیکھنا چاہتی تھی — پھر جیوانند بھی (انہوں نے افریقی نوجوان کی طرف اشارہ کیا) یہ جگہ دیکھنا چاہتا تھا۔ سو ہم چلے آئے — بھوک لگ آئی تھی۔ اس لئے سوچا پہلے پیٹ پوجا کرلیں۔ پھر رشی کی پوجا کریں گے۔"

اس پر کھنہ صاحب نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ لیکن حسن دین نے کانوں پہ انگلیاں رکھ لیں کہ اُسے بابا رشی کی توہین نہ سُننی پڑے۔

"کہیئے کل کیا پروگرام ہے —!" یکایک کھنہ صاحب نے پوچھا۔ حسن دین چوکنا ہوگیا۔

"اوشا تو کہہ رہی ہے کل کھلن مرگ چلنے کو لیکن ہمارا تو ارادہ آرام کرنے کا ہے"

"ہم خود کل کھلن مرگ چلنا چاہتے ہیں — آپ لوگ ساتھ چلیں تو الپتھر کی فیروزن لیک بھی دیکھ آئیں —!"

"انکل، آپ ضرور چلئے —!" اور کھنہ صاحب کا بچہ اُن کے گلے سے جھول گیا بچہ اتنا پیارا تھا کہ اُپل صاحب نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

"چلئے نا انکل — آپ تھک جائیں گے تو دونالے پر بیٹھ جائیے گا — ہم لوگ جھیل دیکھ آئیں گے۔" اوشا نے کہا۔

"نہیں انکل — میں آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا —! آپ چڑھائی پر میری بانہہ پکڑ لیجئے گا —!" بچے نے اُن کی گردن سے جھولتے ہوئے کہا۔!

"اچھا بیٹا چلیں گے —!" اور انہوں نے اُسے چوم لیا۔

"خدا بڑا کارساز ہے —!" حسن دین نے من ہی من میں خدا کے حضور میں سجدہ کیا

"اُس نے میری دُعا قبول کی تو اُسے پورا کرنے کا ذریعہ اُس بچے کو بنا دیا۔"

کھانا کھانے کے بعد آپ صاحب تو وہیں لیٹ گئے۔ اوشا اور جیوانند سے انہوں نے کہا کہ وہ جاکر بابا رشی کا مزار دیکھ آئیں۔

حسن دین نے اپنے آپ کو پیش کیا کہ وہ انہیں دکھا لاتا ہے اور وہ کھنہ صاحب سے بولا۔ "صاب ابھی کھانا کھایا ہے۔ تم کچھ دیر آرام کرلو۔ ہم ادھر ان کو بابا رشی کے درشن کرا دیتا ہے اور ذرا چائے بھی پی آتا ہے۔"

کھنہ صاحب خود کچھ زیادہ کھا گئے تھے وہ بھی دری کے ایک طرف نیم دراز ہوگئے۔ ان کی بیوی بچے کو دوکان سے وہی ٹوپی لیکر دیتے چل دی اور حسن دین بڑی خوشی سے اوشا اور جیوانند کو لے چلا۔

دل اُس کا خوش تھا۔ بابا رشی کے لئے اتھاہ اعتقاد سے بھرا ہوا تھا۔ خدا اور بابا رشی میں وہ کوئی فرق نہ دیکھ پاتا تھا — بابا رشی پہنچے ہوئے فقیر تھے اور عوام کی زبان میں پہنچے ہوئے کا مطلب خدا کو پہنچے ہوئے سے ہے۔ اس لئے حسن دین کی نظر میں بابا پیام الدین اور خدا کوئی دو نہیں تھے۔ وہ گلمرگ کی سیر کرنے کے لئے آنے والوں کو بابا رشی کے درشن کرانا ایک کارِ ثواب سمجھتا تھا کیا بابا رشی نہیں جانتے کہ وہ پیسہ اس لئے نہ اکٹھا کرنا چاہتا ہے کہ وہ اُن کی منت پوری کرے۔ اس لئے تو وہ اُس کی مدد خود کر رہے ہیں۔ اُس نے سوچا اور وہ دگنی اُمنگ سے اوشا اور جیوانند کو بابا رشی کی کہانی سُناتے لگا اُس نے نہ صرف اُن کو بابا کے مزار کا طواف کرایا۔ بلکہ وہاں رکھے بڑے بڑے دیگوں کے بارے میں بتایا کہ کیسے تہواروں کے دنوں میں یہ چڑھائے جاتے ہیں اور قربانی کے کئی ڈبے اُن میں پکتے ہیں۔ اُس نے انھیں بابا رشی کی یادگاری نشان دکھائے اور اُن سے کہا کہ وہ کھڑکی کی جھلملی میں

تاگا باندھ کر کوئی منت مانیں ۔

جیوانند لمبا، چھریرا، ہلکے سانولے، لیکن تیکھے نقوش والا نوجوان تھا ۔ وہ حسن دین کی باتیں چپ چاپ سنتا آیا تھا ۔ اُس نے بابا رشی، اُن کی زندگی، اُن کے معجزوں اور اُن کے مزار اور مجاوروں کے بارے میں ایک بھی سوال نہ کیا تھا۔ اُدھر اوشا لگاتار چہکتی چلی آئی تھی ۔ اور حسن دین بڑی اُمنگ سے بابا رشی کے درخت کی اہمیت سُناتا اور اُس کے ہر سوال کا جواب دیتے آیا تھا ۔ جب حسن دین کے کھیلی سے تاگا باندھ کر منت ماننے کے کہا تو جیوانند خاموشی سے اِس طرح خلا میں تکتا رہا۔ جیسے یہ بات اُس سے نہیں کہی گئی کسی اور سے کہی گئی ہے ۔

اوشا نے ایک بار کھوگوار شتکر سا دھیان لگائے اُس نوجوان کو دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بے اختیار چمک اُٹھیں ۔ ہونٹ مسکراہٹ میں کھلے پھر حجاب سے سمٹ گئے ۔ پھر اُس کا چہرہ اچانک سُرخ ہو گیا ۔

"میں منت مانوں گی — !" اس نے اچانک سر اُٹھا کر جیوانند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

لیکن جیوانند کھیلی کے پار، بہت دُور ۔ جیسے افریقہ کے بے کراں جنگلوں کی گہرائیوں میں کھو گیا تھا ۔

اوشا شوخ و چنچل سی منجھلے قد کی لڑکی تھی ۔ موٹی تو نہیں تھی لیکن اُس کا جھکاؤ موٹاپے کی طرف ضرور تھا ۔ پہلی نظر میں وہ ایک آدھ بچے کی ماں، گھریلو عورت لگتی تھی اور حسن دین نے بھی اُسے اُن صاحب کی بیوی سمجھا تھا لیکن بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ وہ اُن کی بھتیجی ہے اور دو ایک سال پہلے اُس نے بی اے کیا ہے ۔ وہ اپنے آپ کو اکیس بائیس سال کی بتاتی تھی ۔ لیکن دیکھنے میں اکتیس بتیس کی لگتی تھی ۔ اس کی وجہ شاید موٹاپے کی طرف کو اس کا جھکاؤ اور نیا رسنگھار میں گہرا جوش تھا جس سے

ہونے کے باوجود ہلکا سا پھوہڑپن، یا یوں کہا جائے کہ جدت کا فقدان تھا لیکن اس لمحے اُس کے پھولے پھولے گالوں، اور نیم بند آنکھوں میں کچھ ایسا خمار چھا گیا تھا جیسے کوئی اُداس اندھیرا کمرہ کسی انجانے جھروکے میں سے آنے والی دھوپ کی ایک تیز کرن سے چمک اُٹھے۔ اچانک وہ حسن دین سے بولی۔

"یہاں باندھنے کو تانگا کہاں سے لاؤں۔"

حسن دین کے ہونٹوں پر آیا کہے "چوٹی کے پراندے سے لے لیجئے" کیونکہ وہ لوگ تو خود ایسے ہی کرتے تھے۔ پھٹے دوپٹے کا کنارا ـــ پراندے یا تعویذ کی ڈوری کا کوئی "تانگا" یہاں باندھ کر وہ لوگ اپنی منت مان لیتے تھے۔ لیکن یہ سب صاحب لوگ جانے بُرا مان جائیں ـــ دوسرے لمحہ اُس نے اپنی زبان کاٹ لی اور بھاگا بھاگا مجاوز کے پاس گیا اور ایک سوت کا تار لے آیا۔

اُوشا نے تانگا اُس سے لیکر ایک پیاری نظر بھگوان شنکر کی طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر اُس چدانند پر ڈال کر "تانگا باندھ دیا۔ اور منت مانی۔ اس کی آنکھیں لمحہ بھر بند ہو گئیں۔ چہرے کی ساری شوخی غنقا ہو گئی۔ ایک مکمل سکون اور ٹھہراؤ، ایک عجیب سی لطافت اور دلکشی۔ دھوپ سے تپی ہوئی دھرتی پر غیر شعوری طور پر اُتر آنے والی میٹھی سی شام کی طرح اُس کے چہرے پر چھا گئی۔ ہلکے ہلکے بے آواز اُس کے ہونٹ ہلتے رہے اور یکایک اُس نے آنکھیں کھول کر اُس سانولے، لمبے، چھریرے خاموش نوجوان کی طرف دیکھا۔ نوجوان کی نگاہیں دُور افریقہ کے گھنے جنگلوں سے پلٹ آئیں۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ اوشا کے چہرے پر ایک انوکھی مٹھاس آگئی اور نوجوان کا رنگ کچھ اور سانولا ہو گیا اور دونوں چل پڑے۔

لیکن حسن دین نے یہ سب نہیں دیکھا۔ آنکھ بند کیے وہ بابا رشی کا شکریہ ادا کرتا رہا کہ اُس نے اپنے اِس ناچیز بندے کی سُن لی اور انہیں ایسی اچھی سواریاں دیں

۔ بابم رشیؔ سے اُس نے وعدہ کیا کہ جوں ہی اُس کے پاس پیسے ہوئے وہ اپنی
۔کی منت کے مطابق عیدو کا نکاح کرنے اُس کے حضور میں آئے گا اور اُس نے
ماں کے لئے بھی دُعا کی ہے ۔ اُس کے من کی مُراد پوری کرے وہ لوگ پھر گلمرگ آئیں
۔ وہی اُن کو بابم رشی کے حضور میں منت پوری کرنے لائے ۔

جب اُس نے آنکھ کھولی تو جیوانند اور اوشا چل چکے تھے ۔ دروازے پر جب
نمانے ہاتھ جوڑے تو حسن دین نے کہا ۔۔ "حضور غریبوں کے لئے خیرات کو
بچے ۔ !"

اوشا نے بے بسی سے ہاتھ ملے ۔ پٹو اوہ اپنے چاچا کے پاس ہی چھوڑ آئی تھی
۔ بنا پلک جھپکائے بابم چہرے پر کسی قسم کے جذبات لائے جیوانند نے جیب سے
پیے روپے کے کچھ نوٹ نکال کر بابا بام دین کے مزار پر چڑھا دیئے ۔

حسن دین کو لگا جیسے خود اُس نے روپے چڑھائے ہوں ۔ جیسے کھنہ صاحب
کچھ بھی خیرات نہ کرنے سے جو گناہ ہوا تھا وہ دُھل گیا ہو ۔ جب جیوانند روپے
چڑھا رہا تھا تو وہ سجدے میں گرا ہوا تھا ۔

مزار کے باہر آکر اُس نے حسن دین سے کہا کہ وہ چائے والے پٹھے سے اُس سے
نسب انتظار کر رہے ہوں گے ۔ اور جیوانند نے ایک روپے کا نوٹ اُس کی طرف
بڑھا دیا ۔

"نہیں صاب ۔۔ اِس کا ثواب کا ہم پیسہ نہیں لے گا ۔ آپ ہمارے
دڑے پر چلے گا، ہم خدمت کرے گا، تو مالک کرم بخشش لے گا ۔ !"

جب بہت کہنے پر بھی اُس نے روپیہ نہیں لیا تو جیوانند نے اُسے واپس جیب میں
ڈال لیا اور دونوں مزار کے پیچھے کو نکل گئے ۔

ہلکے سے نشے میں سرشار حسن دین بازار کو لوٹا وہاں اُس نے سپیرو کے ساتھ ہری

نمکین چائے پی اور پھر اُس نے کھنہ صاحب سے کہا کہ وہ چلیں، نہیں تو دیر ہو جائے گی۔

وہ جس راستے سے نیچے گئے تھے اُدھر سے وہ اُنہیں نہیں لایا۔ ذرا سا چکر دے کر سرکلر روڈ کے ایک حصّے سے، اِدھر پہاڑوں کا نظارہ کراتا وہ اُنہیں بالکل گلمرگ ہوٹل کے پاس لے آیا۔ ایک دم وہیں جہاں سے وہ ٹنمرگ سے آتے ہوئے اُترے تھے سرکلر روڈ سے گھوڑے جب نیچے کو ہوئے تو بکا یک بچہ چلّا اُٹھا "بابو جی ہم تو اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔!"

ہوٹل کے باہر ہی کھنہ صاحب ان کی بیوی اور بچّہ گھوڑوں سے اُتر گئے۔ کھنہ صاحب نے بیگ حسن دین سے لے لیا۔ اور "کتنے ہوئے تمہارے پیسے؟" کہتے ہوئے جیب سے بٹوا نکالا۔

لیکن حسن دین نے نہ پیسے بتائے نہ لیئے۔ "لیکن صاب! تم تو کل کھلن مرگ اور الپتھر جانے والا تھا۔ ہم تم کو کل الپتھر دکھا کر لائے گا۔ پھر پیسہ لے گا۔!" وہ بولا

"ہم کھلن مرگ تو ضرور جائیں گے۔!" کھنہ صاحب بولے۔ "الپتھر کا ہم کہہ نہیں سکتے۔ ہماری سیٹیں بکڈ (BOOKED) ہیں۔ ٹکٹ ہم لے آئے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بس سے رہ جائیں۔ اور آٹھ دس روپے کی ڈنڈ اور پڑ جائے۔!"

"کچھ فکر نہیں صاب! تم صبح چلے گا تو ہم تم کو الپتھر اور فیروزن لیک دکھا کر ٹائم سے بس پر پہنچا دے گا۔!"

"کتنے بجے چلنا ہو گا۔!"

"صبح سات بجے یہاں سے نکل چلیں تو گیارہ بجے افرا بٹ پہنچ سکتا ہے تم اس وقت جلدی سو جاؤ اور صبح چھ بجے اُٹھ کر تیار ہو جاؤ۔"

"تم صبح کتنے بجے آئے گا۔؟"

"ہم ساڑھے چھ بجے یہاں پہنچ جائے گا۔!"

"لیکن ہمارے پاس الارم والارم تو ہے نہیں ہے۔ ہمیں جگائے گا کون۔ تم ایسا کرو، صبح چھ بجے آجاؤ۔ ہمیں بھی جگاؤ اور ہمارا ناشتہ بھی تیار کراؤ۔ آرڈر ہم ابھی دے دیں گے۔ جتنے میں تم ناشتہ بنواؤ گے۔ ہم ہاتھ منہ دھو، کپڑے بدل کر تیار ہو جائیں گے۔!"

"کچھ فکر نہیں صاب۔! ہم صبح چھ آئے گا۔ تم سب کو بھی جگائے گا اور بیرے سے ناشتہ بھی تیار کرائے گا۔ آرڈر تم ابھی دے دو۔"

"ہم کو تو دس بارہ پراٹھے چاہئیں اور کوئی آلو والو کا سوکھا سالن۔ اچار ہمارے پاس کافی ہے۔!"

"صاب کچھ آملیٹ وامبلیٹ بنوا لو۔ اوپر سردی سے بدن گرم رہے گا۔"

"انڈے ونڈے ہم نہیں کھاتے۔!"

"کچھ فکر نہیں صاب! ہم ابھی جا کر بیرے کو بولتا ہے کہ تین نمبر والے صاب کے لئے بارہ پراٹھے اور آلو گوبھی کی سوکھی ترکاری بنا دے۔ تم بیڈ ٹی تو لے گا"

کھنہ صاحب نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "یہ بیڈ ٹی وغیرہ انگریزوں کی نقل کرنے والے پیتے ہیں۔ ہم تو صبح اٹھ کر ٹھنڈے پانی کا گلاس پیتے ہیں۔ ہمیں بیڈ ٹی کی عادت نہیں۔"

اور حسن دین اندر کی طرف بڑھا تب کھنہ صاحب چلائے۔ "دیکھو۔ بیرے سے کہنا ابھی پراٹھے بنا کر نہ رکھ دے۔ صبح اٹھ کر ہم کو تازہ پراٹھے بنا دے۔"

وہیں سے مڑ کر اور کمبل کو گلے میں لپیٹے ہوئے حسن دین نے کہا "آپ فکر نہیں صاحب۔ ہم اس کو بھی بولے گا۔"

اگرچہ چھ سے زیادہ کا وقت نہیں تھا لیکن شام گلمرگ کے میدان پر پوری

طرح آ تر آئی تھی۔ سامنے بازار کی دوکانوں کی اکیلی قطار دُھندلی سی پڑ گئی تھی۔ ایک دو بتیاں بھی جل گئی تھیں۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ اور بائیں طرف افرابٹ کی چوٹی پر برف کی دھاریاں اُداس ہو گئی تھیں۔ گھنّہ صاحب کی بیوی اُن کے ملحقہ سے بیگ لے کر اندر جانے لگی تو انہوں نے کہا ''چلو ذرا بازار تک ہو آئیں۔''

''اسے آپ بازار کہتے ہیں۔ سب دوکانیں بند پڑی ہیں — عبدو کہتا تھا کہ ایک سکھ کا ڈھابہ کھلا ہے اور سرکاری ایمپوریم۔ کیا دیکھیں گے وہاں۔!''

''تو بھی چلو ذرا گھوم آئیں۔''

''گھومنے سے آپ کی طبیعت نہیں بھری۔ یہاں تو بدن چور چور ہو کر درد کر رہا ہے۔!''

حسن دین پیرے کو آرڈر دینے کو آگیا تھا۔ اُس نے کہا ''صاب اس وقت تم آرام کرو۔ صبح جاتے وقت ہم تم کو بازار کی طرف سے لے چلیگا۔ چھ بج چکا ہے۔ ایمپوریم تو بند ہو چکا ہوگا۔''

اور اُس نے صاحب اور میم دونوں کو سلام بولا۔

''ہم کو بھی سلام بولو۔ ہم بڑا صاب ہے۔'' اچانک بچہ بولا۔

حسن دین ہنسا اور کچھ جھکتے ہوئے اُس نے کہا ''بڑے صاب! سلام'' اور مڑ کر کمبل لپیٹتا ہوا وہ گھوڑوں کے پاس پہنچا۔ عبدو اور ممدو وہیں راستے کے ایک طرف بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ حسن دین نے سر کا اشارہ دیا۔ دونوں اُٹھ لئے۔ گھوڑے کی لگام تھام اور رکاب پر پیر رکھ ایک ہی جھٹکے سے چڑھتے ہوئے حسن دین نے جوش اور خوشی سے پکارا — ''یا پیر! دستگیر...!'' عبدو اور ممدو دونوں گھوڑوں پر چڑھتے ہوئے چلائے۔

اور گھوڑے ٹنگمرگ کی طرف اُڑ چلے۔

صبح ابھی مشرق کا نسکاری پہاڑوں کے پیچھے سے جاگنے کی کوشش ہی کر رہا تھا جب حسن دین اپنے بیٹے اور ممدو کے ساتھ گھوڑے دوڑاتا ہوا گلمرگ پہنچا۔
رات اُس نے گھر پہنچتے ہی پہلے گھوڑوں کو دانہ کھلایا تھا۔ پھر اُن کی دونوں اگلی ٹانگیں باندھ کر ایسے کہ وہ چل سکیں لیکن بھاگ نہ سکیں۔ اُس نے اُنہیں گاؤں کے باہر پہاڑ کی ڈھلان پر چرنے کو چھوڑ دیا تھا۔

پریز پورا اگرچہ مقابلتاً سپاٹ جگہ پر آباد تھا۔ لیکن ڈھلانوں پر خوب گھاس تھی۔ گھوڑے گھاس چرتے چرتے اگلی دونوں ٹانگوں کو ایک ساتھ اُٹھا کر پھدکتے کافی دور نکل جاتے تھے۔ کسان علی الصبح اُٹھ کر انہیں پکڑ لاتے تھے۔ حسن دین کے گھوڑے صبح سے سواری پر تھے۔ وہ اُنہیں اُس جگہ لے گیا جہاں ڈھلان پر گھاس کا ایک کھیت ایسا سپاٹ قطعۂ زمین تھا۔ گھوڑے وہاں پہنچتے ہی لوٹنیاں لگانے لگے۔ چاروں پیر آسمان کی طرف کر کے لوٹنی لگاتے، اُچک کر اُٹھتے اور پھر اسی طرح لوٹنے لگتے۔

حسن دین چند لمحے تک اُنہیں لوٹنیاں لگاتے دیکھتا رہا تھا۔ وہ جب بھی اُنہیں لوٹنیاں لگاتے دیکھتا تھا۔ اُسے وہ کہاوت یاد آ جاتی تھی جو اُس نے ایک وزیر سے سُنی تھی۔

ہاں کیوں مرا ہے؟
مورچہ کیوں پڑا ہے؟

گھوڑا کیوں اَڑا۔"

اور جواب بھی اُس کے ذہن میں کوند جاتا۔

بچھیرا نہ تھا۔۔۔!

یہ عجیب بات ہے کہ آدمی جب تھک جاتا ہے تو سونا چاہتا ہے اور گھوڑا تھک جاتا ہے تو لوٹنیاں لگاتا ہے ۔۔۔ اُسے خیال آیا کہ اگر اُسے دولت مل جائے تو وہ اپنے گھوڑوں کے لئے ایک ایسا آدمی رکھے جو اُن کے پٹھوں کو تھکان کے بعد خوب زور سے ملے اور اُن کی خدمت کرے۔ کئی سال پیشتر اُس نے ایک انگریز کے بنگلے میں سائیس کو گھوڑے کی خدمت کرتے دیکھا تھا اور اُس کے ذہن میں وہ ہمیشہ کے لئے نقش ہو گیا تھا۔

وہ واپس مڑا۔ انگریز کے اس اصطبل کی یاد آتے ہی دولت مند ہونے بارے میں اُس کے ہوائی قلعے پھر معرضِ وجود میں آ گئے۔ اس مرتبہ اُسے پولیس نہیں پکڑا اور وہ ایک لاکھ روپے کو تقسیم کرتا ہوا لوٹا۔ اُس کی پہلی ضرورت روٹی اور کپڑے کی تھی..... اُس نے نہ صرف اپنی بیوی بچے، بلکہ اپنے بھائی کے بیوی بچوں کے لئے بھی بڑھیا کپڑے سلوائے۔ اُس کے گودام ہر قسم کے اناج سے بھر گئے تھے۔ گاؤں کے باہر اُس نے بڑا مکان بنوایا۔ پھر اُس نے بڑی شان و شوکت سے بابا رشی منت مانی اور عیدو کا نکاح اپنے بڑے بھائی کی بیٹی سے کیا۔ پھر اُس نے گھوڑوں کے لئے بڑا اصطبل بنوایا۔ اُس کے گھوڑے سری نگر، پہلگام اور گلمرگ میں چلنے لگے۔ تصور ہی تصور میں اُس نے دیکھا کہ اُس کے گھوڑے دن بھر کی سواری سے واپس آتے تو انہیں بڑھیا دانہ ملتا ہے اور سائیس لوگ ان کے پٹھوں کو کپڑے کے گدوں کی سے بڑے زور سے سہلاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے برسوں پہلے اُس نے انگریز کے اصطبل میں دیکھا تھا ۔۔۔ پیسہ اُس کے پاس کھنچا چلا آ رہا ہے اور اُس نے

اور شادی کرلی ہے اور گلمرگ میں بنگلہ بنوایا ہے ۔"

لیکن تبھی اُس کے کانوں میں یاسمین کی آواز پڑی وہ محمود سے کہہ رہی تھی کہ ذرا جائیے دیکھئے کہ عیدد کا ابا رحمان کی دوکان پر تو نہیں رہ گیا ۔ صبح نور کے تڑکے سے اٹھ کر جانا ہوگا۔ وقت سے کھانا کھائے اور سو گئے ......

ور حسن دین نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اُس کے پاس دولت کا یکسر فقدان ہے اور وہ گناہ کی زندگیوں سے یکسر بچا ہوا ہے ۔ اور اُسے تعجب ہوا کہ وہ اپنی اس محنتی، وفادار بیوی کا خیال کیسے چھوڑ بیٹھا ۔ لیکن خدا کا شکر ادا کرتے اور سنہرے سپنوں کو جھٹکا دے ان ہوائی قلعوں کو منہدم کرنے کے باوجود اپنے گھروندے کی ان گھڑ سیڑھیاں چڑھتے بڑھتے اُس نے پھر سوچا کہ اُس کے پاس اگر دولت آئی تو وہ اپنی اس وفادار بیوی کو گہنوں کپڑوں سے لاد دے گا ۔

کھانا کھاتے ہوئے اُس نے اپنی بیوی کو بتایا تھا کہ آج صبح اُس نے سچے دل سے خدا کے حضور میں جو دعا مانگی تھی، وہ لگتا ہے کہ اُس نے سن لی ہے ۔ اُسے بڑی بھی سواریاں ملی ہیں ۔ اُسے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اس مہینے صبح برنام سنگھ کی ہی ڈیوٹی ہے گی ۔ اور اُسے پورا یقین ہے کہ وہ اتنا کمالے گا کہ کھانے کپڑے کے لئے نکال کر "بابا رشی" کی منت پوری کرسکے ۔

کھانا کھا کر وہ اوپر اپنی اماں اور بڑے بھائی کو بھی من کی بات سنا آیا تھا ۔ رجب وہ سویا تھا تو یاسمین اُس کے پاس آگئی تھی اور دونوں دیر تک عیدد کے تاج اور "بابا رشی" کی ضیافت کی تفصیل میں اُلجھے رہے تھے ۔

گہری طشتری جیسا گلمرگ ابھی نیند کے خمار میں سویا ہوا تھا ــــ دھانی نغموں کی مخمل صبح کے جھٹپٹے میں مونگ کے رنگ کی گہری ہری دکھائی دے رہی

تھی ۔ مرگ کا نالا گھاس کے اُس میدان میں کسی اژدھے کی طرح سویا پڑا تھا۔ پگڈنڈیاں گھاس میں سوئی کھوئی غنودگی کے عالم میں بیہوش تھیں ۔ سامنے خالصہ ہوٹل اور پیرے دائیں طرف بازار کی ایک عجیب دوکانوں کی قطار مکمل سناٹے میں خاموش تھی اور بائیں طرف ازابیٹ کے پیچھے دو نالے کی دو دھیا نہریں ۔ ان پتلی دبلی، نازک اندام دوشیزاؤں کی طرح خاموش کا احساس رہتی تھیں، جن کی خوابیدہ نیم وا آنکھوں میں پیار کی نگاہوں نے ابھی نہ جھانکا ہو ۔

لیکن حسن دین کی نگاہوں نے وہ دلکش منظر دیکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ برج (RIDGE) پر سے گھوڑا دوڑاتا، وہ ڈھلان پر جا کر رکا۔ گلمرگ ہوٹل کے گیٹ پر وہ گھوڑوں سے اُترے، حسن دین نے اپنے گھوڑے کی لگام عیدو کو دی اور کمبل کے لٹکتے سرے کو دوسرے کندھے پر ڈالتا ہوا وہ گیٹ کے اندر گیا۔ جا کر اُس نے بیرے کو جگایا کہ وہ اُٹھ کر صاب لوگوں کے لئے ناشتہ اور لنچ کا سامان تیار کرے ۔

وزیٹر چونکہ زیادہ نہیں آتے تھے اس لئے ہوٹل کے مالک نے ایک بیرا اور ایک کک ہوٹل کے لئے رکھ چھوڑا تھا ۔ بیرا ہی ہوٹل کا منیجر تھا ۔ وزیٹروں سے کرایہ طے کرتا ۔ بل بناتا ۔ پیسے لینا ۔ سب کام وہی کرتا تھا ۔ جانے وہ پہلے سے بیرا تھا یا ہوٹل کے مالک ہی کا کوئی رشتہ دار یا قابلِ اعتماد آدمی تھا۔

"تین نمبر والے صاب کو آج ہی الپتھر دیکھ کر ٹنگمرگ سے بس پکڑنا ہے ۔" حسن دین نے بیرے کو سمجھایا ۔ "اور ایک نمبر والے کو بیڈ ٹی نہیں ملے گا تو وہ اُٹھے گا نہیں ۔ اس کا لڑکی کو فیروزن لیک جانا ہے ۔"

اگرچہ یہ بات بیرے کو گذشتہ شام ہی سمجھا دی گئی تھی ۔ تو بھی اس نے اُس پر زور دینا غیر ضروری نہیں سمجھا ۔ اُس نے دونوں صاحبوں سے گذشتہ شام وعدہ کیا تھا کہ وہ صبح سب چیزیں اُنہیں وقت سے بنوا دے گا۔

جب باورچی جاگ اُٹھا اور اُپل صاحب کے لئے چائے تیار ہو گئی — تو ادھر بیرا اُن کے کمرے میں چائے لے گیا۔ اُدھر حسن دین نے کھنہ صاحب کو جا جگایا کہ وہ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر ناشتے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اتنے میں وہ ناشتہ بھجواتا ہے۔

اور واپس جا کر اُس نے کچن میں بیرے سے کہا کہ وہ خود کُک کی مدد کرتا ہے۔ وہ سینڈوچ وغیرہ تیار کرے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اُس نے سب کچھ تیار کرا دیا۔

لیکن صاحب لوگ ابھی تیار نہ ہوئے تھے۔ اُن کو جلدی تیار ہونے کے لئے کہہ کر اور اس بات کا ڈر دکھا کر کہ وہ لوگ جلدی نہیں چلیں گے تو کھلن مرگ سے جہلم اور وار کا بڑھیا ویو (view) نہیں لے سکا۔ وہ بیڑی کا کش لگانے باہر آ گیا

اُپل صاحب کے سائیس بھی آ گئے تھے اور عیسیٰ وا ور محمد کے ساتھ ہی ہوٹل کی دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھے تھے۔ حسن دین بھی اُن ہی کے ساتھ جا بیٹھا۔ اپنے فرن کی گہری جیب سے اُس نے بیڑی نکالی، اور اُسے سُلگا کر چپ چاپ کش لگانے لگا۔

دُھوپ نکل آئی تھی اور اُس کی سنہری کرنیں اس وسیع میدان پر جہاں جہاں پڑی تھیں، سبز، سنہرے چکتے پڑ گئے تھے۔ صبح کی کُندنی دُھوپ نے مرگ کو عجیب دلکش حسن بخش دیا تھا۔ افراباٹ کی نازک اندام دوشیزاؤں نے اگرچہ ابھی تک آفتاب کی محبت بھری نگاہوں کا لمس نہیں پایا تھا۔ لیکن اُن کی مغمومیت عنقا ہو گئی تھی — اور کچھ عجیب سا اُمنگ بھرا اشتیاق، کچھ عجیب سی اشتیاق بھری بے قراری اُن کی بچیں مشریانوں میں دوڑ گئی تھی۔

حسن دین آنکھیں کراُٹھا۔ سبھی تیار ہو گئے تھے۔ بھاگتا ہوا اپنے کمبل کو کندھے پر ڈالتا ہوا وہ اندر آگیا۔ اُپل صاحب بھی تیار تھے۔ حسن دین نے اُن کے ساتھیوں کو بھی آواز دی۔

"لو بھائی، اٹھاؤ سامان چل دو۔" کھنہ صاحب نے کہا۔

وہی کل والا کینوس کا تھیلا تھا اور برساتیاں اور ایک چھاتہ اور دو چھڑیاں تھیں، جو حسن دین کے کہنے پر ہی انہوں نے ساتھ لے لی تھیں۔

"صاب۔ لنچ سنبھال لیا۔۔۔؟" اُس نے اچانک پوچھا۔

"ہاں پراٹھے بنوا لیئے ہیں بارہ۔ اور آلو اور گوبھی کی ترکاری ہے اور اچار تو دودھا داسنگھ کا ہے۔ جس کے شلجم کا اچار کی سارے ہندوستان میں دھوم ہے"

حسن دین نے کینوس کا بیگ کمبل میں باندھ کر کمر میں لٹکا لیا۔ چھاتا اور برساتیاں ممدو کو دے دیں۔ ایک چھڑی سعیدو کو دی ایک خود ہاتھ میں لی اور سواریوں کا گھوڑوں پر سوار کرا دیا۔

"کدھر کو چلے۔۔۔؟" اچانک اُپل صاحب نے پوچھا "راستہ تو ادھر سے جاتا ہے"

"ہم ادھر سے چلو صاب۔۔۔!" حسن دین بولا۔ "ہم صاب کو بازار سے گھما کر لاتا ہے۔۔۔!"

"بھائی پانی تو اوپر مل جائے گا نا؟" اچانک کھنہ صاحب نے پوچھا۔

"صاب پانی تو ہوگا، لیکن برف کا۔۔۔ پھر پانی ادھر اترائی پہ ملے گا۔"

"پیاس لگے تو۔۔۔؟"

"پیاس تو تھرمائی میں صاب، خوب لگتا ہے۔" پھر چند لمحے رک کر اُس نے کہا۔ "صاب تم لیمن اسکواش کا ایک بوتل ساتھ رکھ لو۔ انگریز لوگ جب

ادھر جاتا تھا لیمن سکواش کا بوتل ساتھ رکھتا تھا۔ برف کا پانی پینے سے گلا خراب ہو جاتا ہے۔!"

"ارے وہ انگریزوں کے نازک گلے ہوں گے جو خراب ہوتے ہوں گے۔" کھنہ صاحب نے قہقہہ لگایا۔ "بازار سے کچھ لیمن ڈراپ لے لیں گے پیاس لگنے پہ چوس لیا کریں گے۔"

"کچھ فکر نہیں صاب! جتنا بولے گا۔ لے لے گا۔!!"

کھنہ صاحب ہنسے۔ "ارے جتنا کیا، ہمیں کوئی دوکان کھولنی ہے۔ چار آنے کا لے لینا۔"

"دو چار آنے کا کیا ہوگا۔۔؟ پڑا جیبوں میں چپ چپ کرے گا۔ دو آنے کا کافی ہوگا۔" شریمتی کھنہ بولیں۔

بازار میں بنئے کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ جس میں آٹا، چاول، دال گھی بھی تھا۔ سبزی ترکاری بھی اور جنرل مرچنڈائز کی چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں بھی۔ کھنہ صاحب نے گھوڑے پہ چڑھے چڑھے ایک روپے کا نوٹ حسن دین کو دیا۔ "چار آنے۔۔۔۔ دو آنے کا لیمن ڈراپس لے لو۔!" وہ بولے۔

حسن دین نے بنئے سے دو آنے کے لیمن ڈراپس مانگے۔

بنئے نے چودہ آنے کی ریزگاری اور ایک عدد لیمن ڈراپ اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

کھنہ صاحب وہیں گھوڑے پہ بیٹھے ہوئے بڑے ہی جھلائے ہوئے لہجے میں چلائے۔ "یہ کیا۔۔؟ دو آنے کا لیمن ڈراپ۔ وہاں تو پیسے پیسے میں ملتا ہے۔!"

بنیا فقیری تھا۔ شاید وہ ذات سے بنیا تھا بھی نہیں۔ پنڈت تھا۔ بڑے

دونوں نے اُسے بنیا بنا دیا تھا۔ میلا سا فرن اُس نے پہن رکھا تھا اور سر پر اُس کے پگڑی تھی۔ چہرے پر اُس کے جھریاں تھیں اور کمر جھک گئی تھی لیکن اُس کا رنگ سانولا تھا اور اس کی ننھی ناک اُس کے کشمیری براہمن ہونے کی چغلی کھا رہی تھی۔

کھنہ صاحب کی بات سُن کر وہ ہنسا۔ "صاحب یہاں یہ نوجوان ہے اس کو آپ بہت نہیں سمجھتا — جہاں یہ پیسے ہیں ملتا ہے وہاں سے یہ جگہ کتنی دور ہے اس بات کو آپ نے نہیں سوچا —!"

کھنہ صاحب لاجواب ہو گئے لیکن اپنے کھسیانے پن کو ایک مکر کھلے قہقہے سے چھپاتے ہوئے بولے "بھائی خوب بات کہی ہے تم نے —!" داد دیتے ہوئے انہوں نے بڑی ہی دریا دلی کے ڈھنگ سے کہا۔ "اچھا ایک چھٹانک دے دو —!"

جب بنیا ایک بڑے سے ترکاری تولنے والے ترازو میں جس میں ایک چھٹانک کا پاسنگ ہی ہوسکتا تھا لیمن ڈراپ تولنے لگا تو حسن دین کی نگاہیں لیمن سکواش کی بوتلوں پر جم گئیں — "وہ کیسے کیسے وزیر آنے لگے ہیں —"، اُس نے دل ہی دل میں کہا — بنئے سے لیمن ڈراپ کی پڑیا لے کر کھنہ صاحب کو دی اور گھوڑے کی لگام تھام کر چل پڑا۔

پیلی پیلی دھوپ سے چمکتی ہوئی دھانی گھاس کا میدان پار کرتے ہوئے وہ نیڈو ہیڈل کے سے گزرے۔ "اس نیڈو ہیڈل کو قبائلیوں نے نہیں لوٹا۔" اچانک کھنہ صاحب نے پوچھا۔

"لوٹا کیوں نہیں صاحب۔ ایک ایک چیز کر کے لے گیا — دربان تک بھی تک ڈھو کے لے گیا۔ بجلی کی فٹنگ (چھوٹا سا نل) کو سونے کا سمجھ کر لے گیا۔" اور حسن دین اُن کی بے وقوفی پر ہنسا۔ "پیتل کی بھی چیز کو وہ سونا سمجھتا تھا۔"

"وزیٹر نہیں تھا ؟"

"سردی کا موسم تھا صاب — !سیزن ختم ہوگیا تھا۔ بنگلہ اور بازار سب بند تھا۔"

"ہم نے سُنا ہے کہ اِدھر کے لوگوں نے بھی یہاں لوٹ مار مچائی۔!"

"ہاں صاب —! بُرا لوگ سبھی جگہ ہوتا ہے —!"

اس نے یہ جواب اس طرح دیا کہ کھنہ صاحب کو مزید سوال کرنے کی ہمت نہیں رہی — وہ خاموش ہو گئے۔ لیکن حسن دین کے سامنے وہ صبح گھوم گئی۔ جب اچانک فتح اور لوٹ کے نشے میں چُور قبائلی ٹرکوں میں ٹنگمرگ آئے تھے اور وہاں سے لوٹ کر گلمرگ کی طرف بڑھے تھے۔ اُنہیں گاؤں سے زبردستی ساتھ لے لیا گیا تھا۔ اور وہ تین دن تک گلمرگ سے سامان ڈھوتے رہے تھے۔ تین گھوڑے کا سامان ایک ایک گھوڑے پر لادا گیا تھا — بہت سے قُلی بھی انہوں نے پکڑے تھے۔ یہی نہیں وہ اپنے سروں اور کندھوں پر لوٹ کا مال ڈھوتے رہے تھے۔ جب وہ چل دیتے تھے تو اردگرد کے گاؤں والوں نے ہلّا بول دیا تھا اور جن گھروں کے برآمدوں تک میں اُنھیں پاؤں رکھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اُن کے کھانے، بیٹھنے اور سونے کے کمروں کو وہ روندتے پھر رہے تھے۔ قبائلیوں کے ہاتھوں جو چھوٹی موٹی چیزیں بچ گئی تھیں وہ انہوں نے لوٹ لی تھیں آپس کی دشمنیاں کُھل کھیلی تھیں۔ اور لوٹنے کے بعد کچھ لوگوں نے دوکانوں کو جلا دیا تھا۔

"لو پیر —"، حسن دین نے تخیُّل کے پردے سے اُن مناظر کو ہٹاتے ہوئے لمبی سانس بھری۔ تبھی کھنہ صاحب نے پوچھا۔ — "کیوں بھائی حسن دین انگریزوں کے آنے سے پہلے یہاں کیا تھا۔ ؟ کیا کوئی گاؤں تھا ؟"

"نہیں صاب —! یہاں تو، ہم سنتا ہے را جنگل تھا۔ اور جہاں یولو

گراؤنڈ ہے ۔ وہاں دلدل تھا ۔ !"

"دلدل"

"جی صاحب ۔ ہم نے تو نہیں دیکھا ۔ لیکن دادا کہتا تھا یہ نالہ اس جگہ اس پولو گراؤنڈ کی گہرائی میں پھیل جاتا تھا اور زمین دلدل والی ہو گئی تھی۔ اور گرمیوں میں گڈریا لوگ بھیڑ بکری چرانا تھا ۔ !"

"انگریزوں سے پہلے یہاں کوئی نہ بستا تھا؟"

"دادا کہتا تھا کہ سلطان یوسف شاہ کبھی کبھی یہاں آتا تھا ۔ لیکن انگریز نے ہی گلمرگ کو بسایا تھا ۔"

اور حسن دین کے سامنے گلمرگ کے سنہری میدان کی وہ تصویر کھنچ گئی ۔ جو دادا کے باتیں سن کر اس کے تخیل نے بنا لی تھی ۔ قدرت جب یہاں اپنے حقیقی روپ میں تھی اور صنوبر اور شمشاد کے جنگل اس میدان کو گھیرے تھے ۔ جن میں کہیں کہیں چیڑ، بیبل اور سپروس کے پیڑ تھے، نہ ہوٹل، نہ بنگلے، نہ جھونپڑیاں اور نہ پولو گراؤنڈ اور گولف کے میدان ۔ نہ سڑکیں نہ بازار ۔ ناگنوں سی چھوٹی چھوٹی بل کھاتی پگڈنڈیاں سرسراتی ہوئی جنگل میں گم ہو جاتی تھیں ۔ آٹھوں پہر سناٹا رہتا تھا ۔ ہواؤں کی "سر سر" اور پتیوں کی "مرمر" ہی سے سناٹا جیسے بہلاتا تھا ۔ یا کبھی کھلے دن کے سکوت میں کسی جنگلی طائر کی سیٹی یا کسی ننھا گڈریے کی تان گونج اٹھا کرتی تھی ۔ پھر انسان کے ہاتھ لگے (ہاتھ تو کالے انسان ہی کے تھے لیکن لگے گورے انسان کے حکم پر) اور آہستہ آہستہ جنگل سدھ گئے نالے بندھ گئے ۔ پولو اور گولف کے میدان بنے، بازار، ہوٹل، کوٹھیاں اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنیں ۔ اور انگریز عورت مردوں کی ۔ ہندوستان کے حاکموں کی جنت ۔ ہندوستان کے صحت افزا مقامات کا راجہ، گلمرگ

انگریز حاکموں کے خوابوں کی تعبیر بننے لگا۔

چڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ حسن دین نے لگام چھوڑ دی تھی اور گھوڑے کے پیچھے پیچھے چڑھا جا رہا تھا۔ "رار، وار" گھوڑے کو تیز چلتے دیکھ کر اچانک اُس کے منھ سے نکل جاتا اور گھوڑا سیدھی چال سے چلنے لگتا۔ آگے ایک اور ٹولی جا رہی تھی۔ تین آدمی تھے لیکن گھوڑا ایک ہی تھا۔ شاید باری باری سے اس پر چڑھتے تھے۔ اچانک کھنہ صاحب کو خیال آیا۔ وہ پیدل کیوں نہ آئے جب یہ لوگ پیدل آسکتے ہیں تو وہ کیوں نہیں آسکتے۔! ..... اور انہوں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"ہم بھی ایک گھوڑا گگو کے لئے لے لیتے اور خود پیدل چلتے۔ گھوڑوں پر لد کے چلے آئے تو سیر کا مزا کیا رہا....."

"پیدل تو صاحب آپ آسکتا تھا!" حسن دین نے آپ کی بات کاٹ کر کہا — "لیکن تم ٹائم سے واپس نہیں پہنچ سکتا۔ تم ریٹرن ٹکٹ لیکر آیا ہے۔"

کھنہ صاحب چپ ہو گئے اور حسن دین پھر اپنے خیالات کا تار پکڑ کر سوچنے لگا — اور اُن دنوں کتنی موج تھی — ایسے ویسے لوگ گلمرگ میں قدم بھی نہ رکھتے تھے۔ انگریز لوگ نہایت فراخ دلی سے خرچ کرتے تھے۔ گرمیوں کے چار مہینوں میں ہی نہیں سردیوں میں بھی جب ساری گھاٹی برف سے ڈھک جاتی تھی انھیں کام مل جاتا تھا۔ سکیٹنگ کے شوقین جوق در جوق آتے اور فراز سے چلتے تو سری نگر کے آدھے راستے تک سکیٹنگ کرتے۔ برف پر کھیلتے چلے جاتے گلمرگ کے بارے میں اُن گورے حاکموں کے کیسے خواب تھے۔ وہ گولف کا ایسا ہی ایک اور خوبصورت دلکش میدان بنانا چاہتے تھے۔ میدان کے کنارے کنارے گھوڑے دوڑانے کے لئے راستہ بچھانا چاہتے تھے جھیل میں مچھلیاں چھوڑ کر

مچھلی کا شکار کرنے والوں کو سہولت بہم پہنچانا چاہتے تھے۔ انگریز اپنی قوم کے بوڑھے جوان، عورت مرد، سب کے لئے گلمرگ کو بہشت بنا دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے کچھ خواب پورے بھی کئے لیکن تبھی ہندوستان آزاد ہو گیا اور اس وقت انھیں ہندوستان ہی نہیں، کشمیر بھی اپنے ہاتھ سے نکلتا محسوس ہوا۔ وہ اس جنت کو آسانی سے چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ انہوں نے سرحد کے بھیڑیے اس گلستاں میں چھوڑ دیئے اور جنہیں گھنٹوں میں گھاٹی کی اس دلہن کا سنگھار لوٹ لیا۔ گلمرگ کی جو دوکانیں جلنے سے رہ گئی تھیں، انہیں گذشتہ برسوں کی برف باری اور سناٹے نے ڈھا دیا۔ اب جب کئی سال کے بعد وادی پھر جاگی تھی۔ نیچے سری نگر میں دو تین برسوں سے وزیٹر آ رہے تھے۔ گلمرگ کی دلہن اسی طرح بے ساز و سامان لٹی لٹی اداس پڑی تھی۔ سرکار نے دو دوکانیں ضرور کھولی تھیں اور ہوٹل والوں نے بھی ایک آدھ منشی یا ایک دو بیرے بھیجے تھے۔ لیکن ان سے کیا رونق ہوتی۔ پہلے جہاں وزیٹر مہینوں رہتے تھے۔ وہاں اب ایک دن، دو دن یا زیادہ ہوا تو ہفتہ بھر رہ کر چلے جاتے تھے۔

لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر کہ مرگ کا بخت کچھ تو جاگا ——— لوگ آنے لگے ایسا ہی امن رہا تو جہاں اب دو دوکانیں کھلی ہیں وہاں سارا بازار کھل جائے گا۔ جو بازار گر گئے یا جل گئے ہیں، وہ پھر بن جائیں گے ——— بنگلے کا بچ — اور کلب آباد ہو جائیں گے۔ گلمرگ پھر گلزار ہو جائے گا اور آس پاس کے گاؤں کی بھوک مٹے گی ...... اور گھوڑے کے پیچھے پیچھے چلتے حسن دین نے خدا کے حضور میں دعا مانگی کہ اب اور جھگڑا نہ ہو۔ لوٹ مار نہ ہو ——— وزیٹر آئیں گلمرگ میں ٹھہریں۔ اور پھر پرانے راگ رنگ ہوں .... سیر تماشے، پکنکیں اور پارٹیاں ہوں ....

"کیوں بھئی حسن دین! یہ سامنے ٹینٹ کیسے لگے ہیں۔؟" اچانک کھنّہ صاحب نے اپنے تخیل کا شیرازہ بکھیرتے ہوئے کہا۔

"وہی کھلن مرگ ہے صاحب!" حسن قدم آگے بڑھا کر بولا — "بس ابھی آدھ گھنٹہ میں پہنچ جائیں گے۔" اور شمشاد کے پیڑ کی پتلی سی شاخ توڑ کر اُس نے گھوڑے کی پیٹھ کو چھوا اور گھوڑے نے تیز تیز قدم بڑھائے۔

اُپل صاحب، اُن کی پتلی بھتیجی اور دو فرنگی نوجوان اُن سے پہلے پہنچ گئے تھے اور خیمہ نما لگے ایک سکھ کے سفری ریستوران کے سامنے، سفری بنچوں پر بیٹھ گئے تھے۔

"صاحب کے لئے چائے بناؤ سردار جی!"

کھنّہ صاحب کو گھوڑے سے اُتارنے کے بعد حسن دین الٹے پاؤں پھر پیسے لکھو سے بولا جو ان مٹی کے سیٹوں کے پیچھے بھٹی کے آگے کھڑا وہ بیروں کو چائے پلا رہا تھا۔

"لیجئے بادشاہو! چائے تیار ہو جاتی ہے۔" اور سردار نے انگیٹھی پر کیتلی چڑھا دی اور اُپل صاحب کے آگے سے خالی پیالے کر دھونے لگا۔

کھلن مرگ کی اونچائی تو بیشک دس ہزار فٹ تھی لیکن راستہ ایسا تھا۔ ادھر کھڑا اور اونچا نیچا تھا۔ کل سے تھکے کھنّہ صاحب کے اعضا درد کرنے لگے تھے۔ گھوڑے سے اُتر کر انہوں نے زور کی انگڑائی لی اور بیوی بچے کو ساتھ لے کر سردار جی کے سفری ریستوران کی طرف بڑھے۔

"کیسے آئے صاحب!" اُپل صاحب نے اُن کا خیر مقدم کیا — "ہم بڑا انتظار

تک آتے آتے خلیہ ٹائٹ ہو گیا ہے اور یہ لوگ افراپٹ تک جانے کی سوچتے ہیں !"
اور اوشا اور جیوانند کی طرف اشارہ کرکے وہ اپنے آپ ہنسے۔

"خلیہ تو رہنا بھی ٹائٹ ہے۔ لیکن افراپٹ تک نہیں تو دونالے تک تو جائیں گے ـــ!" انہوں نے نگاہ اٹھا کر دونالے کی دودھیا نہر کی طرف دیکھا۔ "ذرا برف کو چھو کر، اس پر کھڑے ہو کر تو دیکھیں کیسی لگتی ہے۔؟"

"نہیں با پوجی! ہم اوپر تک جائیں گے ـــ وہاں چوٹی تک ـــ وہاں ہماری نوٹو کھینچنا ـ" ٹکو مچلا۔

"ارے ہم تو تمہارے ہی لئے کہتے ہیں ـ نعاب جاسٹ کا ـ نہیں تو افراپٹ کیا البتھر اور فیروزن لیک تک جائیں ـ!"

"باپو جی ـــ! ہم البتھر فیروزن لیک تک جائیں گے ـ ہم بالکل نہیں تھکیں گے۔" بچہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھنہ صاحب سے چمٹ گیا۔

"ہاں، ہاں جائیں گے ـــ!" مسٹر کھنہ نے اسے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "ادھر بیٹھ کر پہلے چائے پی ـــ!" اور انہوں نے ریستوران کے مالک سکھ سے پوچھا! "سردار جی، کچھ کھانے کو ہے ـــ!"

"ہاں، ہاں، بھین جی ـ! بسکٹ نے، بند نے! تو س نے ـــ کی لئو گے ؟"

"دو توس اس کے لئے دے دو ـــ!"

"نہیں ممو جی ـ میں تو کریم رول لوں گا ـ!"

"کریم رول یہاں کہاں ملے گا ـ" ممی جی نے کہا۔

"نہیں، نہیں، میں کریم رول لوں گا ـ" بچہ مچلا۔

"لئو منّا جی، جنے کریم رول دیئے آں ـ!" سردار نے کہا اور اندر جیبھے میں چلا گیا ـ دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں تازہ دکھائی دینے والا کریم رول تھا۔

بچّے نے ہاتھ بڑھایا تھا کہ ممّو جی نے اُس کی بانہہ پکڑ لی — "کتنے کا ہے —!" انہوں نے جیسے گولی داغی۔

"چھ آنے کا —!"

"تین آنے کا —!"

"دو تین آنے میں سرینگر میں کریم رول ملتا ہے۔ اور تم اس سوکھے سڑے باسی کے چھ آنے مانگ رہے ہو —"

"رات کو یہ سرینگر سے آیا ہے — ایکدم تازہ ہے۔"

"ہاں تازہ ہے! ابھی مشکل سے نو ساڑھے نو بجے نہیں! ورنہ تم سرینگر سے تازہ پیسٹری لے آئے ہو!"

"بی بی جی! اب تو دس بجنے والے ہیں۔ ابھی آپ کے آگے میرا بھائی یہ سب لیکر پہنچا ہے —!"

مسز کھنہ نے اس بات کا جواب نہیں دیا — کچھ پیار اور کچھ ڈانٹ سے انہوں نے بچّے سے کہا۔ "نہیں بیٹے۔ باسی پیسٹری نہیں کھاتے۔ پیٹ دُکھنے لگتا ہے کبھی تو سن لو۔"

سردار نے مزید بحث کرنا بیکار سمجھا۔ وہ کریم رول لئے ہوئے واپس خیمے میں چلا گیا۔

تبھی کھنہ صاحب چلائے — "او سردار جی! چائے کتنی دیر میں بنیگی"

"بس بیٹے تیار ہو جاندی اے بادشاہو! ذرا کولے بجھ گئے سن!" اور وہ انگیٹھی کو ہوا کرنے لگا۔ "ٹھنڈ وی کتنی ہے۔ ہتھنے انگیٹھی بالی سی۔ اک کینکلی گرم بیتی نے کولے ٹھنڈے پے گئے" انگیٹھی کو ہوا کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

ککو ابھی تک کریم رول کے لئے مچل رہا تھا کہ حسن دین نے کہا۔ "چلو تمہیں دو لہر

دکھائیں۔"

بچہ فوراً اُٹھا۔ کھنہ بھی اُٹھے۔ چلتے چلتے اُنہوں نے اُپل صاحب سے کہا۔

"کیوں صاحب! آپ نے وولر دیکھی۔؟"

"ہمیں تو نظر نہیں آئی۔ دھند ہو گئی ہے...... دو گھنٹہ پہلے آتے تو شاید نظر آتی۔"

"آئیے صاب! ہم دکھائیں۔" حسن دین نے کہا اور آگے آگے چلا۔

کھلن مرگ میں پیڑ پودے نہیں تھے۔ پیڑ پودے کھلن مرگ سے نیچے رہ جاتے ہیں۔ وہاں تو بس پتھر ہیں یا گھاس ہے۔ جہاں بھیڑیں چرتی ہیں۔ گھاس کا یہ قطعہ جس پر سردار جی نے خیمہ لگا رکھا تھا بہت بڑا نہیں تھا۔ لیکن یکسر ہموار تھا اور وہاں ایک بھی پتھر نہیں تھا اور وہ گھاٹی کی طرف کو بڑھا ہوا تھا۔ حسن دین نے اُنہیں آہستہ چھوٹے سے میدان کے سرے پر لے گیا۔

"وہ دیکھیے وولر اور جہلم۔" اُس نے سامنے کی طرف اُنگلی اُٹھاتے ہوئے کہا۔

کھنہ صاحب اُن کی بیوی اور بچے نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حسن دین کی اُنگلی کی سیدھ میں دیکھا لیکن نہ اُنہیں نہ اُنہیں کچھ دکھائی دیا نہ دریا۔ آسمان صاف ہو تو کھلن مرگ کی اسی اونچائی سے گلمرگ اور اُس کے پرے کشمیر کی ساری وادی بھی دکھائی دیتی ہے۔ جنگل، ندی نالے، دھان کے کھیت، وولر جھیل اور اس کے پرے پیر پنجال اور ننگا پربت کی عظیم برفانی چوٹیاں۔ لیکن سورج چڑھ آیا تھا۔ ہلکی ہلکی دھند نے سب پر چھا گئی تھی اور اگرچہ قرب و جوار کے جنگل، ندی نالے اور دھان کے کھیت دکھائی

دیتے تھے۔ لیکن ڈل اور جہلم اور پُرمکھ اور ننگا پربت کی برفانی چوٹیاں دُھند کی وجہ
نظر نہ آ رہی تھیں۔

"کہاں ہے دولر جھیل ممّو جی ـــ!" بچّے نے ماں سے چمٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں تو کہیں دکھائی نہیں دیتی ـــ" ممّو جی جھلّا کر بولیں

"میری اُنگلی کی سیدھ میں دیکھئے میم صاحب!" حسن دین نے اُدو شمال کے
پہاڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــ "وہ اس پہاڑ کے ساتھ جہاں عربی
اونٹوں کے سے دو کوہان بنے ہیں۔"

"اچھا وہاں ـــ!" کھنّہ صاحب یکایک خوش ہو کر بولے۔ "پھر انہوں نے
اپنی بیوی کو بتاتے ہوئے کہا۔" دیکھو، وہ ایم جیسی پہاڑی ہے نا....."

"ایم.... ایم کیا ـــ؟"

"ایم نہیں جانتیں ـــ؟ ارے انگریزی کا لفظ ایم..... وہ دیکھو سامنے
کے پہاڑوں کے اُدھر بیچ میں ایم جیسی پہاڑی ـــ"

"جی ـــ"

"جی، اُس سے پرے پہاڑوں تک جو گہرائی ہے وہی ڈُلر جھیل ہے۔" حسن
دین بولا۔ "اور اس کے اُدھر جو نیلا نیلا لکیر ہے وہی جہلم دریا ہے۔"

"وہاں وہاں ـــ!" کھنّہ صاحب کچھ وافر مسرّت سے بولے۔ "سمجھ گئے، سمجھ
گئے۔" حالانکہ اس خوشی اور مسرّت کے باوجود اُن کے لہجے میں یقین و اعتقاد
کا یکسر فقدان تھا۔

"کیا سمجھ گئے ـــ!" اُن کی بیوی جھلّائی۔ "ہمیں تو کچھ دکھائی نہیں دیتا
اور یہ کہتا تھا کہ کھِلن مرگ سے بڑا اچھا ویو دکھائی دے گا ـــ جھوٹے وعدے کر کے
یہ لوگ باہر سے آنے والے بھولے بھالے وزیٹروں کو ٹھگتے ہیں۔"

"ہم کو باپو رشی کی قسم میم صاحب! اگر ہم جھوٹ بولا ہو۔ تم اس سڑک سے پوچھو کر تیج صبح کیسا اچھا ویو دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے ہم بولتا تھا صبح آنے کو۔ ہم تو پیچھے ہی کہا تھا اس وقت چلتا تو یہ دھند اور بادل نہیں ہوتا۔ ایک دم کلیئر ویو دکھائی دیتا ہے۔ وہ دیکھئے بادلوں میں پرمکھ کی چوٹی اور ننگا پربت۔ اس وقت بادل ہے پھر بھی دونوں چوٹی دکھائی دیتا ہے۔!"

کھنہ صاحب نے آدھ ننگا ہی ڈالی۔ سفید سفید بادلوں میں برفانی چوٹیوں کو الگ کر لینا آسان نہ تھا۔ لیکن اسی وفورِ مسرت سے انہوں نے کہا ۔۔۔ "ہاں ہاں دکھائی دیتی ہیں۔!"

"ادھر ٹرائی پٹ سے ویو اور بھی اچھا دکھائی دے گا صاحب! ہم صاحب کو سب دکھلائے گا۔ صاحب کو چائے جلدی پینا چاہئے۔ واپسی میں گرم پانی ٹائم پر نو بجے اوپر ہونا چاہئے۔"

کھنہ صاحب کی بیوی اور بچہ دونوں اور جہلم کو دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ جب ریستوران والے سکھ نے آ کر کہا "صاحب! چائے تیار ہے۔ آ کر پی لیں۔ پھر ویو دیکھیں۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"لیجئے صاحب! ہم نے نوٹ کر لیا ہے۔" کھنہ صاحب تو اپنے پاس کی کرسی بیٹھنے کے لئے دیتے ہوئے "اپل صاحب بیٹھیے۔" "دیشا اور جیوا تم آپ سب کی فرزانت ٹیک دیکھنے جا رہے ہیں۔ ہم دونوں یہاں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

انہوں نے گمبھیرتا سے اس موضوع پر رتن کی تعریف میں بڑے پیار سے بھاری بھرکم نگاہیں دیں۔ جن کی وجہ سے انہیں چڑھائی پر چڑھنا ایک دم ناممکن تھا۔

"میرا تو ارادہ دونالے سے پھرنے کا ہے۔ لیکن یہ بچے ہنگامہ کر رہا ہے۔"

اوپر جانے کو۔ ""

ریسٹوران والے سکھ نے چائے کا پیالہ اُن کے آگے رکھ دیا۔ اور توس بنا کر پیچھے کو مڑنے لگا۔ تب کھنہ صاحب نے دیکھا کہ حسن دین ابھی تک اُن کے پاس کھڑا ہے۔

"کیوں کیا بات ہے حسن دین۔" اس کی ملتجیانہ نگاہوں کو دیکھ کر کھنہ صاحب نے پوچھا۔

"حضور ہم لوگوں کو چائے پینے کے لئے پیسے مل جائیں۔!"

"پیسے کیا کرو گے۔ ایک ایک پیالہ تم لوگ بھی پی لو۔" کھنہ صاحب بولے۔

"جی نہیں صاحب، ہم ادھر ٹینٹ میں پیئے گا۔!"

تب کھنہ صاحب نے دیکھا پیچھے ایک چھوٹا سا میلا خیمہ لگا ہے۔ جہاں کچھ گھوڑے والے اور قلی چائے پی رہے ہیں۔

"نہیں نہیں! تم بھی یہیں پیو۔" انہوں نے کہا۔ اور ریسٹوران والے سکھ کو حکم دیا کہ اُن کے لئے بھی ایک ایک پیالہ چائے بنائے۔

"جی نہیں۔! یہ لوگ ہماری چائے نہیں پیئیں گے۔" سکھ کے لہجہ میں کچھ عجیب سی مجبوری تھی۔

"تم بناؤ تو سہی، یہ پیئیں گے۔"

"صاحب! ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے! ہم بنا دیں گے۔!"

تب حسن دین نے آگے بڑھ کر قدرے درشتی کے ساتھ کہا۔ "جی نہیں صاحب ہم یہاں چائے نہیں پیتا۔ آپ ہمیں پیسہ دیجئے۔!"

"پیسے ویسے نہیں ملیں گے۔ تمہیں چائے پینا ہے یا ہم سے پیسے ٹھگنا ہے۔"

"صاحب ہم لوگ یہاں چائے نہیں پیتا! اپنے خیمے میں پیتا ہے۔!"

"ہم سے پینا ہے تو ہمارے ساتھ پیو، نہیں اپنے پیسے سے پیو!"
"لائیے ہماری حساب میں ایک اٹھنی دیجئے!"
"یہ لو! روپیہ لے لو۔!" کھتہ صاحب نے جیسے بڑی دریا دلی سے کہا اور روپیہ اُس کی طرف پھینک کر چائے پینے لگے۔

حسن دین روپیہ اُٹھا کر عقب کے خیمہ میں چلا گیا۔ اور اُس نے مسلمان چائے فروش سے تینوں کے لئے نمکین چائے بنانے کو کہا۔ سماوار میں کشمیری چائے کھول رہی تھی۔ چائے فروش نے عبدو، ممدا اور حسن دین کو مٹی کا ایک ایک پیالہ تھما دیا اور ہلکی سی سُرخی مائل چائے اُن کے پیالوں میں اُنڈیلی۔ چائے بہت گرم تھی۔ حسن دین کے ہاتھ جلنے لگے۔ تب اُس نے پیالے کو فرن کے دامن پر رکھا اور آہستہ آہستہ چائے پینے لگا۔ اُس کا ماتھا پہلی بار ٹھنکا اور اُسے لگا کہ سواریوں کو سمجھنے میں اُس سے بھاری غلطی ہوگئی ہے۔ اچھے خاندانی وزیٹر اپنے ساتھیوں کو ایسے مجبور نہیں کرتے بنی ہوئی بات تھی۔ سب جانتے تھے کہ کشمیر کے مسلمان سکھوں کے ہاتھ کا نہیں کھاتے بات صرف حلال دھبکے کی تھی ۔ یا اُس کی جڑیں اُس گہری نفرت میں جمی تھیں۔ جو رانا رنجیت سنگھ کے سکھ صوبیداروں کے ظلم و ستم ۔ یا کچھ ہی سال پہلے کے فرقہ وارانہ دنگوں نے مسلم کشمیری عوام کے دلوں میں پیدا کردی تھی ۔ وجہ کچھ بھی ہو ۔ حسن دین بچپن ہی سے دیکھتا تھا کہ اچھے وزیٹر، ہندو ہوں۔ انگریز ہوں یا سکھ اُن کے اس جذبہ کا احترام کرتے تھے۔ مکمل مرگ سے پڑاؤ پر چار چار آنے کی سماوار میں جانا معمولی بات تھی۔ انگریز تو روپیہ بھی دیتے تھے۔ ظاہرا طور پر کھتہ صاحب نے پیسے بچانے کے لئے بہانہ بنایا تھا۔ جو چائے کے لئے چار آنے نہیں دیتا۔ وہ بخشش کیا دیگا۔ اور گھوڑے کا بھاڑا کیسے۔ پیسے کیا دیگا۔ ، حسن دین نے سوچا۔

اس نے جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھرے لیکن اُس کی طبیعت اندر ہی کھلی۔

"ایک گرم پیالہ اور دو۔ اسپنجر تو ایسا کنجوس ملا ہے کہ چار آنے چائے کے نہیں دیے۔"
اُس نے کشمیری زبان میں چائے فروش سے کہا۔

"میں نے تو سمجھا ہے کہ یہ جو اُس نے دیا ہے بخشش ہیں۔" ممدو کشمیری میں بولا۔

"بخشش وخشش کی کوئی اُمید نہیں۔ بس دو نالے سے آگے نہیں جائیں گے۔ ... صاحب تو بنیا سیٹھ معلوم ہوتا ہے۔"

چائے فروش نے قہقہہ لگایا۔ ممدو اور عبدو بھی ہنسے لیکن اُن کی ہنسی میں درد اور مایوسی تھی۔ تبھی چائے فروش نے حسن دین کا پیالہ بھر دیا۔ وہ چپ چاپ پینے لگا۔ دل میں اُس نے طے کر لیا کہ اب وہ اِس بات کے متعلق کچھ نہیں سوچے گا۔ لیکن دو ایک گھونٹ بھرنے پر پھر وہی بات اُس کے دماغ کو پریشان کرنے لگی۔ پچھلے دن کے چھوٹے چھوٹے واقعات جن کی طرف اپنی اُمنگ میں اُس نے توجہ نہ دی تھی اپنی حقیقی شکل میں اُس کے سامنے آنے لگے۔ دراصل وہ ان ہندوستانی وزیٹروں کو اچھی طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔ اُس نے ایسے ہندوستانی سیٹھ بھی دیکھے تھے جو بظاہر بڑے بدھو سادے لگتے تھے۔ کھانے کو صرف دال روٹی کھاتے تھے مگر بخششیں کسی انگریز سے کم نہ دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب کھنہ صاحب نے پنج بس سیٹھ دینا نہ منوا کر پہ اچھے لیے تو اُس نے اس بات کو اہمیت نہ دی تھی۔

لیکن اب اُسے یاد آیا کہ اگرچہ انہوں نے مینار وچوں کے بارے میں تعریف کا اظہار کیا تھا لیکن اُن صاحب کے سیٹھ دونوں پر بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارا تھا۔ بابم ریشی کی زیارت پر اُن کا کچھ نہ چڑھانا اور چائے وغیرہ کے لیے اُنھیں کچھ نہ دینا اور دس روپے کا نوٹ دکھا کر ٹرخا دینا اب اُسے اکھرا۔ اور اُسے محسوس ہوا کہ وہ سیٹھ کو پہچاننے میں دھوکا کھا گیا ہے۔ بہت کم ایسے وزیٹر دیں

سے اُسے واسطہ پڑا تھا جیسے اُس نے افرابٹ پر لیمن سکواش کی بوتل لے جانے کی صلاح دی ہو اور انہوں نے لیمن ڈراپ پر ہی صبر کر لیا ہو۔ اُسے صبح ہی خبردار ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن سیٹھ نے بابُم رشی کو جاتے وقت اپنی دریا دلی کا جو نکھار کیا تھا وہ اس کے دھوکے میں آ گیا۔ "یقیناً یہ کوئی ڈالیا ہے۔" اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ "ڈالیا نہیں تو نمبری بخیل ہے۔"

اور جیسے اس فیصلے پر پہنچنے سے اُس کا دماغ بالکل صاف ہو گیا۔ اور وہ چائے کی چسکی لینے لگا۔

لیکن کھنّہ صاحب چائے پی کر اوپر جانے کو بیتاب ہو گئے تھے۔ وہ چائے پی رہا تھا۔ جب انہوں نے اُس کے خیمے کے پاس آ کر کہا۔ "چلو بھائی حسن دین! اب تک کے ٹائم ہمیں افرابٹ پہنچ جانا چاہیئے۔!"

حسن دین چل دیا۔ اگرچہ چلنے کو اُس کا من ذرا بھی نہ تھا۔ وہ تو بڑا خوش ہوتا اگر کھنّہ صاحب کھلن مرگ سے ہی واپس ہو جاتے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ کھلن مرگ آنے والے دو نالے کی برف کو چھوئے اور اُس پر دو ایک قدم چل کر دیکھے بغیر واپس نہیں جاتے۔ دو نالے تک تو اُسے جانا ہی پڑے گا۔ اس نے سوچا اور دو نالے سے آگے وہ ہرگز نہ جائے گا۔ وہ لوگ افرابٹ جائیں یا الیتھر۔ لیکن وہ آگے نہیں بڑھے گا۔

سب سے آگے کھنّہ صاحب کا بچّہ تھا۔ پھر اُن کی بیوی۔ پھر کھنہ صاحب اور اُن کے پیچھے اُپل صاحب کی پارٹی۔ اُپل صاحب کی بھتیجی اور جیوانند آ گئے

ہو گئے تھے ۔ لیکن کھنہ صاحب کا بچہ رونے لگا تھا کہ وہ سب سے آگے جائے گا اور اوشا کی منت سماجت کر کے انہوں نے بیچے کو سب سے آگے کر دیا تھا ۔ پھر چونکہ اُن کا بچہ آگے تھا اس لئے وہ بھی آ کے آگے ہو گئے تھے ۔ شمشاد اور صنوبر کے اونچے اونچے سائے اور درخت اور بڑی بڑی جھاڑیاں کہیں بہت پیچھے چھوٹ گئی تھیں ۔ کھلن مرگ اور دونالے کے درمیان صرف پتھر تھے اور بیچ بیچ میں خودرو گھاس اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں یا جڑی بوٹیاں ۔ سامنے افرابٹ کی چوٹی تھی جس کی برف ایک جمی ہوئی ندی کی شکل میں نیچے تک چلی آئی تھی اور دونالے سے پھر آ کر دو حصوں میں بٹ گئی تھی ۔ ایک حصہ کھلن مرگ سے کوئی ایک میل کے فاصلہ پر تھا ۔ اور دوسرا اور بھی پیچھے دوسری طرف چلا گیا تھا ۔ اور دکھائی نہ دیتا تھا ۔

وہ لوگ نالے کے اُس حصے کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے ۔ جو کھلن مرگ کے قریب تر تھا ۔ سب کی نگاہیں برف کی اُس چمکتی ڈھلان پر جمی تھی ۔ حسن دین جانتا تھا کہ وہ لوگ وہاں پہنچ کر چند لمحے چپ چاپ ساکت و جامد کھڑے بیوقوفوں کی طرح اُس برفانی ڈھلان کو دیکھتے رہیں گے ۔ پھر اُسے چھو کر دیکھیں گے ۔ پھر شاید کوئی برف کا گولہ بنا کر ایک دوسرے پر پھینکے ۔ یا چار قدم چل کر پھسلے ۔ یا صرف برف پر کھڑے ہو کر ایک آدھ فوٹو لے ۔ بس صرف اتنے ہی کے لئے شاید لوگ اتنے اوپر آئے تھے ۔ صرف اتنی سی بات کے لئے ۔ وہ لوگ کیوں اتنا روپیہ خرچ کرتے تھے یہ بات کبھی حسن دین کی سمجھ میں نہ آئی تھی ۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ شہروں میں ہی برف شربت یا پانی میں ڈال کر پی جاتی ہے ۔ پھر یہ لوگ اس کو یہاں دیکھنے کے لئے ہزاروں میل کی منزل مار کر، ہزاروں روپیہ خرچ کر کے کیوں آتے ہیں ؟ اور اگرچہ وہ روزانہ خدا کے حضور میں دعا کرتا تھا اور بابا ہیم رشی سے منت مانگتا تھا کہ وہ لوگ اور بھی زیادہ تعداد میں آئیں اور دونالہ ہی نہیں افرابٹ اور السپتھر تک جائیں ۔ لیکن

اس کے یہ سب سنانے کی وجہ اُس کی سمجھ میں نہ آتی تھی ۔ ــــ وہ غریب تھا۔ وہ لوگ
اس کے گھوڑوں پر آتے تھے ــــ اور اُسے مزدوری ملتی تھی ۔ جو بات وہ سمجھ
نہ پاتا تھا ـــــ وہ تھی اُن لوگوں کے آنے کی وجہ ـــ پیسے والے ہیں من کے مطابق
پیسہ اُٹھاتے ہیں ۔ یہ کہہ کر وہ اپنے تجسس کو تسکین دے لیتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں
کے ساتھ بیٹھا تھا تو وہ لوگ ان شہریوں کی سنک پر ہنسا کرتے تھے ۔ انگریزوں
کی بات اُن کی سمجھ میں آتی تھی ـــ وہ لوگ سرد ملکوں کے رہنے والے تھے ۔ گرمیوں
میں نیچے رہ جانا اُن کے لئے مشکل تھا ــــ پھر وہ یہاں آکر بے وقوفوں کی طرح
برف کو دیکھ چھُو کر نہ چلے جاتے تھے ۔ وہ کئی کئی مہینے یہاں رہتے تھے ۔ اس برف
کا لطف اُٹھاتے تھے ۔ اُس پر کھیل کھیلتے تھے ۔ بھالو اور کستوری ہرن کا شکار
کرتے تھے ۔ اِن شہریوں کی طرح منھ بناتے برف کو دیکھ کر مطمئن نہیں ہو جاتے تھے
اور حسن دین سوچتا تھا کہ اگر اُس کے پاس خوب پیسہ ہو تو وہ کشمیر میں رہنے کے بجائے
بمبئی ۔ کلکتہ جائے ۔ اپنے لڑکے کا نکاح کرنے اور گاؤں میں پکا مکان بنوانے کے
بعد وہ خوب زمین خریدے ۔ اُس میں سیب ناشپاتی ۔ خوبانی ۔ اخروٹ اور بادام
کے درخت لگائے اور اُن کا کاروبار کرے اور دلی بمبئی اور کلکتہ کی سیر کرے ۔
وہاں کی سُنی سنائی رنگین زندگی کی مبہم سی تصویریں اُس کے تخیل میں گھوم جاتیں
اور اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ شہری اُس رنگین زندگی کو چھوڑ کر ان بے رونق تنہا
پہاڑوں میں کیا کرنے آتے ہیں ـــ !

ابھی وہ دونالے سے ادھر ہی تھے کہ کھنہ صاحب نے آنکھوں پر کالا چشمہ
لگا لیا ـــ بس پر اُنھیں کسی مسافر نے بتایا تھا کہ چمکتی برف کو سیدھی آنکھوں کبھی
نہ دیکھنا چاہیئے ۔ نظر کمزور ہو جاتی ہے اور سرینگر پہنچتے ہی انہوں نے پہلی بات یہ
کی کہ ایک بازاری چشمہ فروش سے بڑے سستے رنگین امریکی چشمے خرید لئے تھے ۔ جو

آنکھوں پر قیمتی چشموں ایسے لگتے تھے - خود چشمہ لگا کر بیوی اور بچے کو بھی انہوں نے چشمہ لگانے کی ہدایت کی

حسن دین ہنسا ۔" یہ لوگ کتنے جاہل ہیں"۔ اس نے دل ہی دل میں کہا برف پر تو مٹی کی تہہ جمی ہے ۔ اس میں وہ چمک کہاں جو سردیوں میں ہوتی ہے یہ لوگ سردیوں میں آئیں تو شاید آنکھوں پر کالی پٹیاں باندھ لیں - پھر اُسے خیال آیا کہ یہ لوگ پیسے والے ہیں ۔ بے کار چیزوں پر صرف کرنے کے لئے ان کے پاس پیسہ ہے اور ابھی اُس کے ذہن میں یہ خیال اچھی طرح آیا بھی نہ تھا کہ اُسے اُن کے ساتھ اِبتھر نک چلا جانا چاہیئے کہ اُس کے سامنے چاسے والا واقعہ گھوم گیا اور اس نے طے کر لیا کہ وہ میر جا ہے ہوں لیکن نہایت کنجوس ہیں اور چاہے جو ہو وہ دو نالے سے آگے اُن کے ساتھ ہرگز نہ جائے گا۔

دو نالے سے کافی اوپر کنارے پر بھیڑوں کا ایک بڑا سا ریوڑ بیٹھا تھا گھوڑوں کے قدموں کی آہٹ سُن کر وہ گھبرا اُٹھیں اور اُن میں سے ایک برف کو پار کرتی ہوئی دوسرے کنارے کی طرف چل دی - دوسری اُس کے پیچھے چلی پھر تیسری، پھر چوتھی..... ڈھلوانِ برف پر کالی کھوری بھیڑوں کی پتلی سی لکیر کھنہ صاحب کو بہت بھلی لگی ۔ گھوڑے سے اُترتے ہی اپنے بچے کی اُنگلی پکڑتے ہوئے کھنہ صاحب بھاگے اور انہوں نے جا کر برف کو چھوا ۔ پھر انہوں نے بچے کے ساتھ برف کو کھود کر گولے بنائے اور ایک دوسرے پر پھینکے ۔ اُن کی بیوی آ کر کنارے کے ایک پتھر پر بیٹھ گئی ۔ کھنہ صاحب نے برف کا ایک گولہ اُس کی طرف پھینک دیا ۔ وہ ایسے بچی جیسے برف کا نہیں فولاد کا جلتا ہوا گولا اُس کی طرف آ رہا ہو ۔ تب کھنہ صاحب نے اپنا کیمرہ نکالا اور کنارے پر فٹ کیا ۔ اُس پر کالا کپڑا ڈالا اور اپنی بیوی اور بچے کو ہدایت کی کہ وہ دونوں برف میں سے اُبھری ہوئی چٹان پر

جا بیٹھیں۔

دونوں چند قدم برف پر گئے ہوں گے کہ پھسل گئے۔

نیمرہ وغیرہ چھوڑ کر کھنّہ صاحب بھاگے۔ لیکن اس سے پہلے کہ کھنّہ صاحب اُنھیں اُٹھاتے وہ خود پھسل گئے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ برف اور خاص طور پر پھسلواں برف پر چلنے کے لئے پیروں میں خوبصورت جوتے اور فقط مشق کی ضرورت ہے اور ایڑیوں کو برف میں دبا کر چلنا پڑتا ہے۔ تینوں ایک دوسرے کو تھام کر اُٹھے لیکن دو قدم چل کر پھر گر پڑے۔

اسی دوران میں اُپل صاحب بھی آ گئے تھے اور کنارے پر کھڑے ہو کر اس منجمد نالے کا نظارہ کر رہے تھے۔ کھنّہ پریوار کو ایک ساتھ گرتے دیکھ کر وہ ہنسی نہ روک سکے۔ حالانکہ کوشش انہوں نے ضرور کی کہ اُن کی ہنسی کھنّہ صاحب نہ سُن سکیں۔ جیوا نند صرف مسکرا دیا۔ اوشا کھل کر ہنسی اور کھنّہ صاحب کی بیوی کو اُٹھانے کے لئے بھاگی۔ لیکن برف پر پہلا قدم پڑتے ہی پھسل گئی۔ اب کے اُپل صاحب زور سے ہنسے۔

حسن دین اپنا گھوڑا مہر سنگھ کے حوالے کر کے دو نالے کے کنارے آ بیٹھا تھا اس کے سر میں ہلکا سا درد تھا۔ بیٹھے بیٹھے اُس نے پاؤں پسار لئے تھے اور کمبل کو کہنی کے نیچے گول مول کر کے اس طرح ترچھا لیٹ گیا تھا کہ آرام بھی کرے اور تھیرے سے فوٹو لئے جانے بھی دیکھ لے...... اُس نے کبھی فوٹو نہ کھنچوایا تھا اور وہ جب کبھی کبھی فوٹو کھینچے جاتے دیکھتا۔ بچوں کی طرح رُک کر دیکھنے لگتا۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا اور اس کی سواری برف پر پھنس جاتی تو وہ بھاگ کر اسے اُٹھاتا اور برف پر چلنا سکھاتا۔ لیکن نہ جانے کیوں ...... نہ جانے کیسی سرد مہری سی اچانک ہی اس کے من پر چھا گئی تھی کہ وہ ...... [illegible] تھا بلکہ ایک نہایت

موہوم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی ۔ لیکن اپنی سواری کے گرنے پر ہنسنا گناہ خیال کر کے اُس نے مسکراہٹ کو ہونٹوں سے پونچھ دیا ۔ مگر جب ادشا بھی پھسل گئی اور رکھنتہ صاحب اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پھر پھسل گئے تو اس کی فطری مسخری نے اُسے جھنجھوڑ دیا .... وہ اُٹھا ۔ اُس نے پہلے ادشا کو اُٹھایا اور اُسے واپس کنارے پر پہنچا دیا ۔ پھر بڑھ کر اُس نے رکھنتہ پریوار کو اُٹھایا ۔ اُنہیں بتایا کہ برف پر کیسے ایڑی ٹکا کر زور دیتے ہوئے چلنا چاہیئے اور وہ پہلے میم صاحب اور چھوٹے صاحب کو نالے کے درمیان اُبھری ہوئی چٹانوں پر بٹھا آیا ۔ پھر اُس نے صاحب کو واپس کیمپ کے پاس پہنچا دیا اور اُن دونوں کو ہدایت دی کہ واپسی پر وہ لوگ اُنھیں قدموں کے نشانوں پر پیر رکھتے ہوئے واپس آئیں جو چٹانوں تک جاتے ہوئے برف پر بن گئے تھے ۔ اس طرح پھسلنے کی کوئی گنجائش نہ رہے گی ۔ اُنہیں یہ سمجھا کر وہ پھر چپ چاپ کنارے پر اپنی جگہ پر آ بیٹھا اور رکھنتہ صاحب کو اپنے بیوی بچّے کا اور چیوانند کو ان کا اور چاچا بھتیجی کا فوٹو لیتے دیکھتا رہا لیکن یہ سب دیکھتے دیکھتے نہ جانے کیسے بیتے دن کے وہی چھوٹے چھوٹے واقعات اُس کے سامنے آنے لگے جنہیں وہ کھلن مرگ سے دو نالے تک دوہرا چکا تھا .... پھر بار بار ۔ وہی چائے والی بات اُس کے من میں گونجنے لگتی ۔ رکھنتہ صاحب کی اور کوئی بات اُسے اتنی بُری نہ لگی تھی ۔ جتنی اُن کا اُسے سکھ کی دوکان پر چائے پینے کے لئے مجبور کرنا ۔ آج تک کبھی ایسا نہ ہوا تھا ۔ ایسے گھٹیا وزیٹر بھی مل جاتے ہیں جو چائے کے لئے پیسے نہ دیتے تھے ۔ لیکن ایسا کوئی نہ ملا تھا جس نے اُس کے مذہبی جذبات کا احترام نہ کیا ہو ۔ بار بار اُس کے دل میں یہ خیال اُٹھتا تھا کہ سکھ وزیٹر تک انہیں الگ اپنے خیمے سے چائے پینے کے لئے پیسے دیتے ہیں ۔ حسن دین یوں سادہ لوح انسان تھا ۔ لیکن اپنے برسوں سے وزیٹروں کو لاتے

بیچاتے۔ وہ انہیں اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ کھنہ صاحب کے کپڑوں، اُن کی دکھاوے
کی فوں، فاں اور لن ترانیوں نے اُسے خواہ دھوکے میں رکھا ہو، لیکن چائے کے
اُس واقعے کے بعد ان کی اصلیت اُس پر پوری طرح عیاں ہو گئی تھی۔ وہ فراخ دل
بھی بنے رہنا چاہتے تھے اور پیسے بھی نہ دینا چاہتے تھے۔ بابا رشی کے ہاں دس دس
کے نوٹ دکھا کر اُسے ٹال دیا اور یہاں اپنے ساتھ (سکھ کی دوکان پر) چائے
پلانے کا بہانہ بنا کر جان چھڑالی ..... اور یہ سب سوچا سوچ کر اس کا دل بے
طرح اُداس ہو گیا تھا۔ چائے کا وہ چھوٹا سا واقعہ اچانک اُس کے سارے
حوصلے پست کر گیا تھا اور اپنی سواری کی جی جان سے خدمت کرنے کا" سے
اچھی سے اچھی جگہ دکھانے کا سارا جوش ختم کر گیا تھا۔ دو راتوں کی شب بیداری
اور تھکان۔ جسے اچھی مزدوری اور بخشیش کی اُمید نے اپنی روشنی میں چھپا رکھا
تھا، نجانے اُس کے تن من کے کن تاریک کونوں سے نکل کر اُس کی نس نس
میں سما گئی تھی۔ اُس کا سر بھاری ہونے لگا؛ ——۔ اسکی آنکھوں میں غنودگی
چھانے لگی۔ اور فوٹو کھنچتے دیکھتے دیکھتے وہ لیٹ گیا اور پھر سو گیا۔

کھنہ صاحب اپنے بیوی بچوں کے فوٹو کھینچ چکے تو انکی بیوی نے پہلے
کی طرح ایک فوٹو بچے کے ساتھ میں۔ جیوانند نے اوشا کے کئی پوز۔ کبھی برف
پر بیٹھے —— کبھی گولے بناتے۔ کبھی برف اُڑاتے اور کبھی برف پر پھسلتے وقت کے
لئے۔ پھر اوشا نے بھی اُس کے دو تین پوز لئے۔ (چاچا کو وہ دونوں ہی نہیں
بھولے۔ اُن کے پوز بھی انہوں نے ساتھ ساتھ لئے) جب وہ لوگ ہر طرح سے
دو نالے کو دیکھ چکے اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کریں تو انہوں نے فیصلہ
کیا کہ افرابٹ چلیں۔ کیونکہ چاچا نے فیصلہ دے دیا کہ وہ خود آگے نہیں جائیں
گے۔ اس لئے اوشا اور بھی پیچھے پڑ گئی کہ وہ افرابٹ دیکھے بغیر واپس نہیں

جائے گی۔ اور آخر چچا نے جیوانند سے کہا کہ وہ دونوں افرابٹ تک ہو آئیں۔
— اور وہ خود دونالے پر اُن کا انتظار کریں گے۔ اور انہوں نے کھنہ صاحب
سے بھی کہا کہ وہ بھی اُن کی بھتیجی کو افرابٹ دکھالائیں۔ گگو نے اپنے پتا کے جواب
سے پہلے ہی اپنی اُس نئی آنٹی کا ہاتھ پکڑ لیا اور گھوڑے کی طرف بڑھا۔
تب کھنہ صاحب نے حسن دین کو آواز دی۔ جب دو آوازیں دینے پر
بھی وہ نہیں اُٹھا اور انہوں نے دیکھا کہ اس دوران میں وہ آدھا کمبل اوپر
اور آدھا نیچے لیکر سو گیا ہے تو انہوں نے بڑھکر اُسے جھنجھوڑا۔
آنکھ ملتا ہوا وہ اٹھا —
"چلو بھئی جلدی چلو —!" کھنہ صاحب نے کہا۔
حسن دین کا سر درد کرنے لگا تھا۔ انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے دونوں
کنپٹیاں دباتے ہوئے اُس نے کہا —!" صاب —! گھوڑا تو یہیں تک آتا
ہے۔ آگے راستے پر برف پڑی ہے —!"
"تم نے کہا تھا کہ جہاں تک چلے گا لے جائے گا —!"
"نہیں صاب —! آگے نہیں جاتا —! لیکن مرگ سے دونالے تک
آنے کا ایک روپیہ اور لگتا ہے۔ لیکن آگے گھوڑا نہیں جاتا — صاب! زیادہ
لوگ تو دونالے تک آتا ہے —!"
تبھی کھنہ صاحب نے دیکھا — کچھ لوگ اوپر جا رہے ہیں دو ولایتی
صاحب تھے اور کچھ دیسی لوگ —
"کیوں صاحب —! کہاں تک جانے کا ارادہ ہے —؟" انہوں نے
آگے جانے والے سے پوچھا۔
"ابھی تو اوپر افرابٹ تک چڑھیں گے۔ وقت رہا تو فروزن لیک —

دیکھیں گے ــــ!"

"کیسی ہے فروزن لیک ــــ؟"

"وہ تو ہم نے بھی نہیں دیکھی ــــ؟"

"دیکھئے صاب ــــ! وہ لوگ پیدل جا رہے ہیں ــــ!" یکایک حسن دین نے کہا۔ "آگے گھوڑا نہیں جاتا ــــ!"

لیکن کھنہ صاحب گرم ہو گئے ــــ "تم نے کہا تھا ــــ میں اپتھو تک لے جاؤں گا ــــ! گھوڑا جہاں تک جائے گا لے جاؤں گا ــــ! ہم کو دھوکے سے لائے ہو اور یہاں آکر بیٹھ گئے ہو ــــ ہمیں پتہ ہوتا کہ اوپر تک نہیں جاؤ گے تو ہم کھلن مرگ سے ہی مُڑ جاتے ــــ یہاں تک بھی نہیں آتے ــــ!"

اُپل صاحب! اوشا اور جیوانند چپ چاپ قدرے اوپر راستے پر کھڑے یہ بحث سُن رہے تھے۔ اُن کے سائیسوں نے اُنہیں دو نالے تک پہنچانے کی بات کی تھی ــــ! لیکن اگر کھنہ صاحب آگے گھوڑوں پر جائیں گے، وہ سوچ رہے تھے، تو وہ بھی جائیں گے۔

حسن دین چپ رہا۔ اُس کے دل میں کوئی کہہ رہا تھا۔ بس یہیں تک۔ اب مت ہلنا۔ اوپر مت جانا۔ پہچاننے میں غلطی ہو گئی تھی۔ یہاں تک کے دام وصول کرو آگے نہ مرو ــــ یہاں تک تو سرکاری ریٹ ہے۔ مل ہی جائیگا۔ اوپر کا کیا بھروسہ ــــ؟ کتنی محنت پڑے اور بعد میں پائی نہ ملے۔ اُس کے سر میں درد آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اُس کا من ہوتا تھا یہ لوگ لوٹ چلیں، وہ پیسے وصول کرے۔ گھر جا کر گرم چائے کے دو پیالے پیئے اور سو جائے اور اگلا سارا دن سوتا رہے۔

لیکن کھنہ صاحب گرج رہے تھے۔

"چلو ہم آگے نہیں بڑھیں گے۔ لیکن یہ جان لو کہ ایک کوڑی ہم نہیں دیں گے۔ چلو اٹھاؤ۔۔۔!"

حسن دین گھوڑی کی طرف بڑھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں تک کے پیسے وہ جھک مار کر دیں گے، ہاں شور ضرور مچائیں گے۔ نہ دینے کے لئے کہیں گے لیکن سردار ہرنام سنگھ کی ڈیوٹی ہے۔ پیسے تو وہ لے ہی مرے گا۔

لیکن کھنہ صاحب کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے حسن دین کے مڑتے ہی گرجے ۔۔۔ "ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ اپنے گھوڑے لے جاؤ۔ ہم کو نہیں چاہئیں گھوڑے ۔۔۔ ہم پیدل چلیں گے ۔"

اور کینوس کا بیگ اُس سے چھین کر وہ چند قدم بڑھے۔ اُپل صاحب بڑے اشتیاق سے یہ ہنگامہ دیکھ رہے تھے۔ کھنہ صاحب کی بیوی اور بچے تذبذب میں وہیں کھڑے تھے۔ بیوی سوچ رہی تھی کہیں سچ مچ پیدل ہی نہ چل دیں۔ ۔۔۔ مڑ کر حسن دین سے بڑے جھنجلاہٹ بھرے لہجہ میں بولی "جب اتنی باتیں کرکے لائے تھے۔ تو کیوں نہیں لے جاتے اوپر ۔۔۔!"

"میم صاحب ۔۔۔! گھوڑا اس سے آگے نہیں جاتا ۔۔۔!"

"جہاں تک جاتے ہیں لے چلو ۔۔۔!"

"میم صاحب ۔۔۔ ہمارا سر درد کر رہا ہے ...... نہیں تو ہم کو جب پیسہ ملتا ہم کیوں نہیں جاتا ۔۔۔؟"

"لو میں تمہیں بام دیتی ہوں مل لو ۔۔۔" اور اُس نے کھنہ صاحب کو آواز دی "سنئیے جی ۔۔۔ ذرا بیگ تو دیجئیے ۔۔۔!"

کھنہ صاحب واپس ہوئے۔ اصل میں وہ آگے بڑھے نہیں تھے ..... مڑنے کا بہانہ کر رہے تھے ...

اپنے خاوند سے بیگ لیکر اُس میں سے امرت انجن نکال کر کھنہ صاحب کی بیوی نے تھوڑی سی بام حسن دین کو دی۔ "جہاں درد ہو رہا ہے۔ وہاں مل لو۔"

بام کو ملتے ملتے حسن دین نے سوچا۔ "اُسے چلنا چاہیئے ——— وہ ٹنگمرگ کے اڈے کا سائیس۔ گلمرگ سے اُسے سواری ملے گی نہیں۔ دن خراب ہو جائے گا۔ واپسی کے پیسے مارے جائیں گے۔ سیٹھ کھلن مرگ سے پیدل اُتر لگا تو پھر اُن کے گھوڑوں پر تو جائے گا نہیں..... ماتھا کھٹکا۔ رہا ہے بخشیش ملے نہ ملے۔ اُسے چلنا ضرور چاہیئے۔ دل سے اُس نے سمجھوتہ کر لیا ...... وہ اپنی طرف سے خدمت کرے گا۔ پھر جو خدا کو منظور!

اور اُس نے تینوں کو گھوڑوں پر چڑھا دیا۔ کھنہ صاحب کی بیوی نے بیگ لیکر کندھے پر لٹکا لیا۔ اور چل پڑا۔ آپل صاحب نے بھی اپنے سائیسوں کو تیار کر لیا کہ جہاں تک وہ لوگ گھوڑوں پر جائیں گے وہاں تک وہ ادشا اور جیوانند کو لے جائیں۔ خود انہوں نے دونالے یا کھلن مرگ پر انکا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

"یو سی! دے آر روگز۔ آئی نو ہاؤ ٹو ڈیل وِد دیم ——!!"
You see They are rogues. I know how to deal with them
اُنہوں نے آپل صاحب اور اپنی بیوی کو سناتے ہوئے فتحمندانہ لہجے میں کہا۔

حسن دین کو لگا جیسے اُس کے سر میں کوئی ہتوڑے مار رہا ہو۔ اُس نے کمبل سر سے لپیٹ لیا۔

ان کی بیوی اتنی انگریزی نہ پڑھی تھی کہ اپنے خاوند کی بات ٹھیک سے سمجھ لیتی۔ لیکن وہ بات سمجھ گئی اور اپنے خاوند کی عقلمندی پر خوش ہو کر

مسکرائیں۔

تبھی اُن کے بچے کی نظر ایک لڑکے پر گئی جو افرابٹ سے برف گاڑی پہ افرابٹ بھرتا چلا آرہا تھا۔ اور ان کے پاس آکر دو نالے پر رُک گیا تھا اُس کے پیچھے خاندان کے دوسرے لوگ برف گاڑیوں پر تیزی سے آتے آرہے تھے اور گکو چلایا۔ "باپو جی ہم بھی برف گاڑی پر چڑھیں گے"۔

"ہاں ! ہاں !! سنا سنا ۔" کھنہ صاحب نے کہا۔ اور گھوڑے کو ٹھکاری ماری۔

اور جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک کشمیری یا لکنڈے پر برف گاڑی لادے کنارے کے پتھروں سے نکل کر اُن کے راستے پر آ گیا اور اُن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"کیوں بھئی۔ سلیج (برف گاڑی) پر افرابٹ سے اُترنے کا کیا لیتے ہو؟" کھنہ صاحب نے پوچھا۔

"آٹھ روپے ۔۔۔ !"

"آٹھ روپے !" کھنہ صاحب ہنسے۔ اور سر کا جھٹکا دیکر اُدھر سے نگاہیں ہٹا کر اُنہوں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

لیکن وہ کشمیری ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

"نالے سے آگے راستہ، بائیں طرف کے پتھروں اور چٹانوں میں کبھی بائیں اور کبھی دائیں ہوتا، چکر کھاتا، اوپر چڑھتا تھا۔ دائیں طرف

افرابٹ سے دونالے تک آنے والی برف کی ڈھلان تھی۔ نجانے برف کتنی گہری جمی تھی۔ اُس کے نیچے، کہیں بہت نیچے۔ نالا بہتا ہوگا لیکن سردیوں میں برف سے ساری کی ساری کھڈ بھر گئی تھی۔ برف کناروں تک آگئی تھی اور ابھی تک پگھلی نہیں۔ جوں جوں وہ افرابٹ کی طرف بڑھتے جاتے تھے برف کا پاٹ بڑھتا جاتا تھا۔ اور اوپر..... بہت اوپر....... افرابٹ کی چوٹی پر تو بڑا چوڑا ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر دل میں تجسس پیدا ہوتا کہ نہ جانے دوسری طرف کیا ہے ــــ برف کا میدان، دونالے جیسی برفیلی ڈھلان؟..... بار بار وہ اس برف کے کنارے آتے۔ پھر دور ہو جاتے پھر پاس آجاتے ــــ اور اس طرح آہستہ روی سے اوپر چڑھتے جاتے۔

درحقیقت راستہ کوئی تھا نہیں۔ سیاحوں کے آنے جانے سے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی بن گئی تھی۔ اور حسن دین لگاتار بڑبڑاتا جا رہا تھا کہ اُس کے کسی گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ گھوڑا دونالے تک رہتا ہے اوپر نہیں جاتا۔ اگر صاحب ٹنگمرگ پر ہی طرح کہہ دیتا کہ وہ الپتھر جائے گا تو وہ اُسے دوسری طرف سے لاتا۔ اُدھر سے الپتھر جانے والا لوگ، تو دونالے پر اُتر آگے پیدل جاتا ہے۔

لیکن کھنہ صاحب اُس کی بڑبڑاہٹ پر کان رکھے بنا برف گاڑی والے سے بھاؤ تاؤ کئے جا رہے تھے۔ اس ایک میل کے راستے میں وہ آٹھ روپے سے چار روپے تک اُتر آیا تھا اور وہ ایک روپے سے ڈیڑھ روپے تک بڑھ گئے تھے۔ نجانے اُس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر دیا تھا یا چونکہ وہ ابھی اُن کے گھوڑے کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس لئے وہ مجبور سے تھے کہ وہ معاملہ پٹا رہا ہے۔ اور برف گاڑیاں کندھے پر رکھے کنارے کنارے سیدھی چڑھائی

چڑھ رہے تھے۔ راستہ جب برف کے نزدیک آتا تو وہ آہستہ آہستہ چڑھتے دکھائی دے جاتے۔ شاید یہ وہی لوگ تھے جو کچھ دیر پہلے اوپر سے سواریاں لائے تھے۔!

ککو کئی بار برف گاڑی پر چڑھنے کے لئے اصرار کر چکا تھا "بابوجی! ہم افراباٹ سے برف گاڑی پر اُتریں گے نا — ؟" وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کچھ ایسے ہی لہجہ بات کرتا اور جب کھنہ صاحب کہتے — "ہاں ہاں بیٹا جی! اُتریں گے"! تو وہ بائیں ہاتھ میں لگام پکڑ کر دائیں ہاتھ سے ہوا کو اوپر سے نیچے تک چیرتا کہ یوں دھڑ سے اُتریں گے اور لگاتار بانفرت ہوا میں گاڑی چلائے جاتا۔ پھر کچھ دیر بعد اپنی ماں سے پوچھتا — "کیوں ممی — ! آپ بھی میرے ساتھ برف گاڑی میں اُتریں گی نا — ؟" وہ ہر طرح سے برف گاڑی کی سیر کے بارے میں مطمئن ہو جانا چاہتا تھا۔

کھنہ صاحب کو اُس کا یوں بار بار پوچھنا بڑا بُرا لگتا تھا۔ اگر سلیج والوں کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ لوگ ضرور برف گاڑیاں کرائے پر لیں گے تو وہ کبھی بھاڑا کم نہ کریں گے اور چار روپے فی سواری تو وہ اس جنم میں نہیں دیں گے۔ اس لئے چاہے لڑکے کو انہوں نے یقین دلا دیا تھا، لیکن گاڑی والے سے کہا — "بھائی — تم جاؤ — کیوں پریشان کر رہے ہو۔ تمہیں دیکھ کر بچہ مچلتا ہے۔ کیوں اپنا وقت برباد کرتے ہو۔ پیچھے سواریاں آ رہی ہیں۔ بڑے امیر لوگ ہیں، اُنہیں گھیرو — ہم پیدل ہی آئیں گے —"!

لیکن برف گاڑی والا لگاتار پیچھے لگا تھا — "صاحب تم اتنا بڑا سیٹھ ہے۔ کیا چار چھ روپے کا مُنہ دیکھتا ہے۔ اتنی دور سے کشمیر کی سیر کو آیا ہے برف گاڑی پر افراباٹ سے اُترےگا تو جنت کا مزا آ جائے گا۔ ہم تو خدا قسم

آٹھ روپے سے ڈبل کم نہیں لیتا۔ ابھی تمہارے سامنے ہمارا ساتھی لوگ آٹھ آٹھ روپے میں سواری لایا ہے۔"

"ارے بھائی کوئی راجہ نہارا جہ ہوتا تو اس آٹھ کے بدلے اسّی روپے دے دیتا۔ لیکن ہم غریب آدمی ہے۔۔۔!"

"ارے سیٹھ کیا بات کرتا ہے۔ غریب آدمی کشمیر کی سیر کو نہیں آتا۔۔۔۔ ہزاروں روپیہ خرچ کر کے آیا ہے۔ ہم غریب، پر کیوں کسر نکالتا ہے۔۔ تم اتنا بڑا سیٹھ ہے۔۔۔"

"بڑا سیٹھ ہے۔۔" حسن دین اس بھاؤ تاؤ کو دیکھ کر دل ہی دل میں جھلایا۔۔ "خاک بڑا سیٹھ ہے۔ کوئی بنیا بقال ہے۔۔۔۔" اُس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بام کی جھنجھناہٹ رہی تھی اور لگا تھا کہ آرام ہو رہا ہے لیکن اب پھر سر میں ہتھوڑے چلنے لگے تھے۔۔ ڈھیلے ہوتے ہوئے کمبل کو اُس نے پھر سر سے لپیٹا۔ ناک میں پانی چلا آ رہا تھا۔ آستین کے بازو سے لے پونچھا دل ہی دل میں اُس نے کہا۔ پیسے سے کوئی تھوڑا ہی بڑا ہو جاتا ہے۔ بڑا وہ جس کا دل بڑا!

"کیوں بھائی ہمارا سودا کرا دو نا۔۔۔؟" سلیج والے نے کچھ قدم پیچھے ہو کر کشمیری زبان میں حسن دین سے کہا۔

"سیٹھ بڑا کنجوس ہے۔۔۔!" حسن دین نے کشمیری ہی میں جواب دیا۔ "لیکن اُسے شام کو ٹنگمرگ سے بس پکڑنی ہے۔ اور وہ اسکیئنگ بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے برف گاڑی لے گا ضرور۔ لیکن وہ اڑھائی سے زیادہ نہیں دے گا!"

اور برف گاڑی والے نے آگے بڑھ کر کہا "سا۔۔۔ب! تمہارا بچہ برف پر سواری کرنے کو مانگ رہا ہے۔ اس کی خاطر ہم تم سے پونے چار روپے

لے لیگا۔ بس اس سے کم ایک ڈبل نہیں لے گا۔ تمہاری خوشی گاڑی لو۔ چاہے نہ لو۔ !"

کھنہ صاحب نے جواب میں صرف گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ٹھکاری بھری اور حسن دین نے سر میں پڑتے ہتھوڑوں کے درمیان سوچا۔ وہ برف کے پل تک جائے گا۔ آگے ایک قدم نہیں رکھے گا۔ چاہے سیٹھ اس کا گھوڑا رکھے چاہے چھوڑ دے اور اس نے فرن کی آستین سے اپنی بہتی ہوئی ناک پونچھی۔

یہ برف کا پل دو نالے سے ایک میل اوپر تھا۔ پل وَل وہاں اس وقت کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ برف افرابٹ کی چوٹی سے لگاتار نیچے دونالے کو چلی گئی تھی۔ ایک دو مہینے بعد، جب نیچے کی برف پگھل جاتی ہوگی اور نیچے نالہ تیزی سے بہتا دکھائی دیتا ہوگا تو اسے برف کے پل کا نام دیا جاتا ہوگا۔ اس وقت تو وہاں اس کنارے سے اس کنارے تک برف پر ایک پتلی سی پگڈنڈی بنی ہوئی تھی.... گھوڑے اس کنارے رک گئے۔ اور حسن دین نے کہا کہ بس گھوڑے اس سے آگے نہیں جائیں گے اور وہ لوگ اتر جائیں۔

"تم بولا تھا ۔۔۔ گھوڑا سیدھا افرابٹ تک جائے گا۔" کھنہ صاحب نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

"صاب! تم اگست میں آتے، یہاں کا راستہ کھل جاتا تو گھوڑا وہاں تک جاتا۔ لیکن آگے راستہ بند ہے۔ گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی اور گھوڑا پھسل گیا تو تم نیچے دونالے تک لڑھکتا چلا جائے گا ۔۔۔ !"

کھنہ صاحب لحظہ بھر چپ رہے۔ گھوڑے پر بیٹھے رہے۔ پھر بولے۔

"گھوڑے تو برف پر چل سکتے ہیں۔ ؟"

"صاب۔ ہم کو یہاں تک آنے پر ہی دوسرے سائیس گالیاں دے رہے ہیں۔ ہمارا حقہ پانی بند کر دیں گے۔ ہم ایک قدم آگے نہیں جائے گا۔"

اُس کے لہجہ میں ایسی سختی تھی کہ کھنہ صاحب نے اُترنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن وہ اترے نہیں۔ ضدی بچے کی طرح بولے۔ "تم نے ہم سے کہا تھا۔ ہم الپتھر تک لے جائے گا" یہ کہتے ہوئے انہوں نے پیچھے کی طرف دیکھا۔ اوشا اور جیوانند گھوڑوں سے اتر رہے تھے۔!"

"صاب۔۔۔ ہم لے جاتا پر راستہ بند ہے" حسن دین بولا۔ ۔۔۔ اور پھر قدرے توقف کے بعد اُس نے کہا "ہم کو اپنا فکر نہیں صاحب! گھوڑے کا بھی فکر نہیں صاب۔۔۔! ہم کو صاب کا۔ میم صاحب کا۔ اور بچہ کا ڈر ہے۔۔۔۔ کہیں گھوڑے کا پیر پھسل گیا تو ہم غریب مارا جائے گا صاب! ہمارا نام بدنام ہو جائے گا صاب۔۔۔!"

کھنہ صاحب کو بھی اُس کی یا اُس کے گھوڑے کی فکر نہیں تھی لیکن انہیں اپنے بیوی بچے کی فکر ضرور تھی۔ وہ گھوڑے سے اُتر گئے اور انہوں نے اپنے بیوی بچے کو بھی گھوڑے سے اُتارا۔

سامنے پگڈنڈی اتنی پتلی تھی اور برف ایسی ڈھلوان تھی کہ اُسے دیکھتے ہی ڈر لگتا تھا۔ "لیکن ہم برف پر کیسے چلیں گے۔۔۔؟" یکایک اُنہوں نے کہا۔

"اُس کا فکر نہیں۔۔۔ ہم صاب کو لے جائے گا۔ صاب کو پار پہنچا کر آئے گا۔ ؟"

"تم کو ہمارے ساتھ افرابٹ تک چلنا ہوگا"۔

"صاب ہمارا طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔!"

"ہم تم کو خوش کر دیں گے ۔ !"

"اس کا فکر نہیں ۔ ہم صاب کا غلام ہے لیکن ہمارا مرد رد کرتا ہے۔ ہم ٹھیک سے کھڑا نہیں ہو سکتا ۔"

اور حسن دین نے گھوڑے کی لگام علیحدہ کر دی ۔ اور اُسے ہدایت کی کہ وہ لوگ دو نالے پر اس کا انتظار کریں ۔

کھنہ صاحب کے بچے کو کسی طرح کا ڈر نہ تھا ۔ وہ سب سے پہلے پار جانے کو مچل رہا تھا ۔ حسن دین نے اُسے ساتھ لیا سمجھایا کہ بائیں طرف کو پیر برف میں دبا کر چلو اور وہ اُسے سہارا دیتا ہوا ادیریوں کے جوتوں سے گندی ہو جانے والی اس لکیر سی پگڈنڈی پر بڑھا ۔

بچہ برف پار پہنچ کر خوشی سے اچھلنے لگا کہ وہ سب سے پہلے پہنچا ۔ تب حسن دین کھنہ صاحب کی بیوی کو پار لے گیا ۔

اگرچہ اُن کا بچہ اور بیوی بآسانی حسن دین کے سہارے اس برف کے پل کے پار ہو گئے تھے لیکن کھنہ صاحب دو بار پھسلے وہ ایسے گھبرائے ہوئے تھے کہ ارد گرد کیا حسین منظر ہے ۔ دیکھنا اس کے لیے یکسر ناممکن تھا ۔ دوسری بار جب وہ پھسلے اور حسن دین نے کھینچ کر اُنہیں کھڑا کیا تو اُن کی نظر برف کی اس ڈھلان پر لڑھکتی ہوئی نیچے تک چلی گئی تھی ۔ اور انہوں نے دیکھا ۔ نیچے بہت نیچے جہاں وہ لوگ دو نالے پر بیٹھے تھے چیونٹیوں کی ایک قطار سرک رہی تھی ۔ وہی بھیڑیں تھیں جو دوسرے کنارے چلی گئی تھیں ۔ اب پھر اُسی کنارے واپس آ رہی تھیں اچانک ایک خیال کھنہ صاحب کے دماغ میں کوندگیا ۔ اگر وہ پھسل جائیں لڑھکتے چلے جائیں تو ضرور ان چیونٹیوں کو روندتے چلے جائیں گے ..... اور ان کے خوفزدہ تخیل نے دیکھا

کہ وہ پھسل گئے ہیں .... لڑھکتے جا رہے ہیں اور ان چیونٹیوں کی بھیڑوں کو اپنے ساتھ لڑھکاتے ہوئے کہیں بہت نیچے جا گرے ہیں۔ جہاں برف ختم ہو گئی ہے اور نالا برف کی قید سے آزاد ہو کر پتھروں میں بہتا ہے.... محض تصور ہی سے اُس سردی کے باوجود اُنہیں پسینہ آ گیا۔ کپڑوں کے نیچے انہوں نے نمی محسوس کی اور وہ حسن دین کے سہارے دو چار لمبے ڈگ بھرتے ہوئے برف کی اُس پگڈنڈی کے پار ہو گئے ...

حسن دین کا خیال تھا کہ وہ اُپلؔ صاحب کی بھتیجی اسد جیوا شندا کو بھی پار آنے میں امداد دے گا، لیکن کھنہؔ صاحب کو اس پار لا کر جب وہ مڑا تو اُس نے دیکھا کہ جیوا شندا ادشا کو سہارا دے کر لگ بھگ پار آ گیا ہے۔

پار آ کر کھنہؔ صاحب چند لمحے خاموش کھڑے رہے۔ اترابٹ ایک دم اوپر دکھائی دیتا تھا۔ سیدھی چڑھائی اور اُن کی سانس پگڈنڈی پار کرتے میں پھول گئی تھی۔ لیکن اُن کا لڑکا چلنے کو بیتاب تھا۔ اور اپنی ماں کا ہاتھ کھینچ رہا تھا۔ کھنہ صاحب اپنی بیوی کے پیچھے چلنے ہی لگے تھے کہ حسن دین نے کہا — صاب، — آپ بیگ لے لیجئے۔ ہمارا طبیعت بہت خراب ہے۔ ہم نیچے دونالے پر آپ کا انتظار کرے گا۔"

" اترابٹ تو تمہیں چلنا ہی پڑے گا ؟" کھنہؔ صاحب جھنجھلا کر بولے۔

" — تمہاری ہی وجہ سے ہم آئے ہیں "

" صاب ہمارا سر درد کرتا ہے !"

" شکن اسے تھوڑی سی بام دو " انہوں نے اپنی بیوی سے کہا۔

" ارے صاب کو بیجا تا کیوں نہیں اترابٹ تک ؟ بڑا ایلتھ ہے۔ خوب بخشش دے گا .... "

کھنہ صاحب کی بیوی نے بیگ سے بام کی شیشی نکالی ہی تھی آواز سن کر کھنہ صاحب مڑے ۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ برف گاڑی والا کندھے پر برف گاڑی اٹھائے اس پار آ گیا ہے ۔

" بخشش کا بات نہیں ۔ ہمارا سرور د کرتا ہے ۔" حسن دین نے بے بسی سے کہا ...

برف گاڑی والے کشمیری نے گاڑی زمین پر رکھ کر شرمیتی کھنہ سے بام لی اور حسن دین کے ماتھے پر مل دی پھر وہ گاڑی کندھے پر رکھ کر حسن دین کو دائیں بغل میں لے کر " کہہ کر لائے ہو تو صاحب کو اوپر پہنچا دو ۔" کشمیری زبان میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھا ۔

کھنہ صاحب چل دیئے ... اوشا اور جیدانند کچھ آگے نکل گئے تھے ۔ اور کچھ اونچائی پر جا رہے تھے کھنہ صاحب کا بچہ انہیں اور آگے بڑھنے کے لئے کھینچ رہا تھا ۔ اور وہ تیز چلنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے ۔

حسن دین اور برف گاڑی والا دونوں سب کے پیچھے چل رہے تھے

" یار معاملہ طے کرا دو ـــ ہم تمہیں چائے پلائے گا ۔" برف گاڑی والے نے اپنی زبان میں حسن دین کے کان میں سرگوشی کی ۔

" میرا سر پھٹا جاتا ہے تمہیں اپنی پڑی ہے ـــ !"

" دو گولی اسپرو ڈھیا قہوے کے ساتھ کھانا ۔ سر درد کا پتہ نہ چلیگا ۔"

" ہمارا قسمت میں تو دیسی اپنی نمکین چائے ہے ـــ !"

" ہم پلائیں گے تمہیں قہوہ ۔" اور اس نے پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارا ۔

پیدل آنے والی پارٹی برف کا پل پار کر رہی تھی ۔ حسن دین نے ایک نظر ان لوگوں پر ڈالی اور آگے بڑھ کر کھنہ صاحب کہا " صاب اوپر پہنچ کر

ایک بج جائے گا۔ تم کھانا بھی کھا سکو گے۔ تم کو ٹنگمرگ سے بس بھی پکڑنا ہے پر وہ گاڑی تم کو پانچ منٹ میں دو نالہ پہنچا دیگا۔ پیدل تو ایک گھنٹہ لگ جائیگا
"لیکن ہم چار پونے چار نہیں دے سکتا"!

"تم بولو۔ تم زیادہ سے زیادہ کتنا دے سکتا ہے؟"

"ہم دو ڈھائی روپے زیادہ ہرگز نہیں دے سکتا۔۔۔!" دل میں انہوں نے حساب لگایا کہ اگر وہ وقت سے بس پہ نہ پہنچے تو اُن پر آٹھ روپے بیکار ضائع جائیں گے کیونکہ وہ واپس ٹکٹ خرید کر گلمرگ آتے تھے۔ وہی آٹھ سلیج گاڑیوں پر خرچ کر دیں گے۔ بچہ بھی خوش ہو جائے گا۔ برف گاڑیوں کی سیر بھی کر لیں گے (ان کو خود شوق تھا کہ وہ چڑھ کر دیکھیں) کیسے اتنی اونچائی سے آدمی سرر، سے ایک دم میلوں نیچے چلا جاتا ہے۔۔!"

"اتنے کم پر تو شاید وہ راضی نہ ہو۔۔!" حسن دین نے کہا۔

"تم کوشش تو کرو اُن کو دینے کے بدلے ہم تمہیں دیں گے۔۔۔۔ دیکھو بھائی اڑھائی روپے سواری اُنہیں مناؤ۔۔!"

لیکن جب چند ہی لمحے بعد حسن دین نے آکر بتایا کہ اُس نے بڑی مشکل سے اُنہیں رضامند کر لیا پھر تو کھنہ صاحب کو بڑا افسوس ہوا

"دو روپے فی سواری کہنا چاہیے تھا اور بچے کے تو آدھے پیسے ہونے چاہئیں تھے" پلٹ کر انہوں نے حسن دین سے کہا۔ "بچے کا ہم سوا روپیہ دیں گے اُس کا تو بس میں بھی آدھا ٹکٹ لگتا ہے۔۔!"

کھنہ صاحب کا بچہ اپنی ماں کو لے کر سب سے آگے نکل گیا تھا۔ پیچھے سے آنے والے بھی آگے نکل گئے تھے۔ چڑھائی ایسی سیدھی تھی کہ کھنہ صاحب کو ہر موڑ پہ سانس لینا پڑتی تھی۔

"صاحب ہمارے پاس دو برف گاڑی ہے۔ ہم تیسرا آدمی کو بھیج دیتا ہے تم اس سے طے کر لو ـــ!" سلیج والے نے کہا۔

"نہیں ہم طے وے کچھ نہیں کریں گے۔ ہم سوار ہو کے بیچ کا دیں گے تیسرا آدمی تمہیں تیار کر لو ـــ!"

اور وہ تیز تیز چلنے لگے۔۔۔ لیکن دو موڑ پار کرتے کرتے ہی ان کی سانس پھول گئی۔ لیکن اس کوشش میں وہ اوشا اور جیوانند سے آگے انکل آئے۔

"پاپوجی! ہم کو چھوئو ـــ! دیکھو ہم کتنا اوپر چڑھ گئے ہیں ـــ"! اکو نے ایک موڑ اوپر سے کہا۔

"آپ کا بچہ صاحب بڑا تیز ہے ـــ!" دونالے سے پیدل آنے والے بزرگ نے کہا ـــ "اتنے میں ہی اُس نے ہمیں دوست بنا لیا ہے اور اپنے کانونٹ، ساتھیوں اور ٹیچروں کے نام اُس نے سب بتا دیئے ہیں"۔

"صاحب! ہم تو کانونٹ کے حق میں نہیں، لیکن ہمارے بڑے بھائی کے کوئی لڑکا نہیں۔ وہ اسے ہی اپنا لڑکا مانتے ہیں۔ سو یہ کانونٹ میں پڑھتا ہے ـــ!" کھنہ صاحب وہیں سے بولے

"نہیں صاحب۔ آپ بہت اچھا کرتے ہیں۔ آپ کے لڑکے کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ـ!"

"ہم تو اُس کے تھک جانے کے ڈر سے اس اونچائی پر آ نہیں رہے تھے۔ لیکن یہ تو بھاگا جا رہا ہے۔ ہم تھک گئے ہیں"!

چڑھائی ایک دم سیدھی ہو گئی تھی۔ اُن بزرگ کو تکلیف ہو رہی تھی۔ "انکل جی! میں آپ کی مدد کرتا ہوں ـــ!" اچانک کھنہ صاحب کا بچہ نیچے اُتر آیا اور ان کا ہاتھ تھام کر انہیں چڑھنے میں مدد دینے لگا اور دیکھتے

ہی دیکھتے انہیں چھوٹی اور سیدھی پگڈنڈیوں کے راستے سب سے آگے لے گیا۔ بچے کے ساتھ بزرگ بھی بچہ بن گئے۔

کھنہ صاحب تھکن کم کرنے کے لئے ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے دیکھا کہ دو تین موڑ نیچے اوشا جھک کر ایک چٹان پر بیٹھ گئی ہے اور جوان اُس سے رنگا اپنی داستان بہت آہستہ دھیرے سے باتوں میں مگن ہے۔ انہیں اپنے اٹھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ جیسے وہ قیامت تک وہیں بیٹھے رہیں گے۔

کھنہ صاحب کو لمحہ بھر کے لئے جوان سے حسد ہوا۔ پھر انہیں خیال آیا کہ اُسے اس بدتمیزی سے روکیں۔ اوشا کے چچا نے انہیں اُس کا خیال رکھنے اور اسے افرابٹ دکھا لانے کے لئے کہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹوکتے انہوں نے سوچا، جانے آپا صاحب اس طرح اس لڑکے کو پھانس ہی رہے ہوں جبھی تو اُسے اکیلے اس کے ساتھ بھیج دیا ہے۔ ولی میں اس منگلی کو اس سے اچھا اب نوجوان شوہر کہاں ملے گا۔ اور اُن کے فرض کا جوش پانی کے جھاگ سا بیٹھ گیا۔ ایک لمبی سانس انکے ہونٹوں سے نکل گئی۔ پہاڑ کی سیر کا مزا تو یہ لوگ لے رہے ہیں۔ وہ خود تو جیسے بیگار کاٹ رہے ہیں اور انہوں نے ایسا ہی دل میں فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ زیادہ پیسے ہی دینے پڑیں وہ افرابٹ کی چوٹی سے سلیج پر ضرور اُتریں گے۔ کچھ یاد تو رہے کہ بار پہاڑ کی سیر کو گئے تھے اور تصور ہی تصور میں وہ سلیج پر ہوا ہو کر کے پیچھے آندھی کی تیزی سے برف کو چیرتے افرابٹ سے اُترے۔۔۔

تبھی برف گاڑی والا دائیں طرف ایک بوڑھے کو ساتھ لیکر ان کے پاس آ کھڑا ہوا۔ حسن دین کو بھی اُس نے ساتھ لے لیا۔۔۔ "صاحب یہ تو ڈھائی روپے پکی تو نہیں ہوتا ہے"

اور اگرچہ ابھی دل ہی میں کھنہ صاحب نے کچھ زیادہ خرچ کرکے بھی برف گاڑیوں کی سیر کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو بھی جب انہوں نے جواب دیا تو اُسے ٹھیک

ہے۔ چلیں گے!" اُن کے ہونٹوں سے نہیں نکلا۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "تو کوئی بات نہیں۔ ہم پیدل ہی جائیں گے۔ ہمیں جلدی نہیں ہے!" انہوں نے کہا۔ اور ایک ہاتھ سے اپنی دائیں ران پر زور دے کر چڑھائی چڑھنے لگے۔

وہ لوگ کھنہ صاحب کے پیچھے آتے ہوئے کشمیری زبان میں تیز تیز باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد بیٹے کشمیری نے آگے بڑھ کر کہا۔ "صاحب! یہ ڈھائی روپے تو لے گا لیکن اس سے کم نہیں لے گا!"

"ہم سوا روپے سے کوڑی زیادہ نہیں دیں گے۔" کھنہ صاحب نے بغیر رکے کہا۔ "لیکن حسن دین کو آواز دے کر سرگوشی میں بولے — "تم ٹھیک سمجھو تو انہیں ڈیڑھ روپے پر رضامند کر لو۔ اس سے زیادہ ہم نہیں دیں گے!"

وہ سب افرابٹ پہنچ گئے تھے۔ جب آخر طے ہوا کہ وہ لوگ چاہے جیسے تقسیم کریں کھنہ صاحب تینوں سواریوں کے سات روپے دیں گے اور کشمیری بیچ ڈرا اور اُن کی بات مان گئے۔

افرابٹ کے کندھے پر ایک بہت چھوٹا سا تکڑے سے ڈھلوان گھاس کا میدان تھا۔ وہاں چند ہی قدم کے فاصلہ پر برف ہی برف پھیلی تھی جو کچھ اور بلندی پر افرابٹ کی چوٹی تک چلی گئی تھی۔ اس برف کے اُدھر کیا ہے، یہ اس گھاس کے میدان سے نظر نہ آتا تھا۔ جو لوگ پہلے آ گئے تھے اُن میں سے کچھ تھک کر ادھر بیٹھے ادھر لیٹے ہو گئے تھے اور کچھ اس میدان کے کنارے جا کر نیچے پھیلی کشمیر کی وادی کا نظارہ کر رہے تھے۔ کھنہ صاحب کا بچہ ان بزرگ سے سامنے کے پہاڑوں اور چوٹیوں کے بارے میں سوالات کر رہا تھا۔ اُن کی بیوی تھک کر لیٹ گئی تھی۔ تبھی انہوں نے دیکھا — افرابٹ کی چوٹی کے نیچے برف کے اُس چوڑے پاٹ پر کوئی برف گاڑی والا جلدی جلدی پیر رکھتا ہوا اوپر کو چڑھا جا رہا ہے۔

برف کی اُس دو دھیا وسعت میں وہ آگے کو بڑھتا چیونٹی سا انہیں بے حد اچھا لگا۔ حسن دین بیگ اُن کی بیوی کو سونپ کر، کمبل بچھا کر، لیٹنے کی کوشش کر رہا تھا کہ انہوں نے اُٹھ کر اُس سے پوچھا ’’وہ کہاں جا رہا ہے۔؟‘‘

’’شاید منڈی بوٹی لینے۔‘‘

’’منڈی بوٹی۔‘‘

’’یہاں اُگتا ہے۔ خوب چنگا بکتا ہے۔‘‘

کھنہ صاحب چند لمحے وہاں کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر وہ چلے۔ وہاں گئے جہاں اُن کا بچہ اور بزرگ کھڑے تھے۔ سامنے وہی منظر تھا جو ٹن مرگ سے دکھائی دیتا تھا۔ ہاں کچھ اور وسیع، کچھ اور ضعیف ہو گیا تھا۔ سامنے جہاں دو ٹرتھی کا نی دُر... سنا اُٹھ رہی تھی۔ اور پر کھڑا اور ننگا پربت کی برفانی چوٹیاں بادلوں میں چھپ گئی تھیں۔ اپریل مئی میں یہاں کا نظارہ شاندار ہوگا۔ انہوں نے سوچا۔ تب کوئی کہہ رہا تھا ’’بادل چھٹنے کے بعد مطلع صاف ہو اور اعلیٰ دوربین آنکھوں پر ہو تو یہاں سے شالامار اور نشاط تک دکھائی دے جاتے ہیں!‘‘

ایک دوسرا شخص اس ولایتی صاحب سے انگریزی میں پوچھ رہا تھا۔

’’کیوں صاحب آپکا سویٹزرلینڈ کشمیر سے اچھا ہے؟‘‘

’’سویٹزرلینڈ چھوٹا ہے کشمیر کی ایک گھاٹی میں سما جائے۔ لیکن ترقی یافتہ زیادہ ہے‘‘ انہوں نے انگریزی ہی میں جواب دیا۔ اُن کے تلفظ میں ’ٹ‘ کے بدلے ’’ت‘‘ اور ’ڈ‘ کے بدلے ’د‘ تھا۔

ایک بجنے کو تھا جب لوگ لنچ پر بیٹھے۔ اوپر آسمان پر پرندوں کی ہی بادلوں کے ٹکڑے اُڑ رہے تھے۔ اپنے بچے کی خوش بیانی اور شوخی کے باعث کھنہ صاحب

اُن بزرگ اور ان کی ٹولی سے کر لی تھی انہوں نے اپنا ایک ایک میٹھا سیب کو بانٹ دیا اور بارے میں نوادرات و اقسام کی چیزیں [illegible] چائے والے اور ان کے ساتھیوں نے [illegible] تو ٹیمن سکواش کی بوتل اور تھرماس میں پانی تھا لیکن کھنہ صاحب اپنی بیوی کے ساتھ حسن و بہشت پہ [illegible] وہاں گئے جہاں [illegible] سیلج والے کھڑے تھے۔ وہاں کنارے پر اگرچہ اِدھر اُدھر برف لگی تھی لیکن نیچے اُسی طرح جمی تھی جیسے کار خانوں میں جمی ہوتی ہے اور اس کے [illegible] پانی کی دھار ٹپک رہی تھی۔ وہیں سے انہوں نے [illegible] گلاس بھر پانی پیا [illegible] اتنا زیادہ ٹھنڈا تھا کہ [illegible] چار گھونٹ [illegible] کھنہ صاحب کی پیشانی میں ہلکا سا درد ہونے لگا۔

اس ٹولی کے ایک دو بچوں کے پاس بڑھیا کیمرے تھے [illegible] اپنے فوٹو لئے تو کھنہ صاحب بھی ان میں شامل ہو گئے۔ وہ لوگ دلی ہی کے تھے (کھنہ) صاحب نے اپنا پتہ انہیں لکھ دیا اور انکا پتہ لکھ لیا۔ کہ اگر وہ خود انہیں فوٹو کا پیاں نہ بھیجیں۔ تو وہ خود جا کر لے لیں اپنے کیمرے سے فوٹو لیکر انہوں نے ایک دو فلمیں برباد کرنا ٹھیک نہیں سمجھا۔

پونے دو کا وقت ہو گا جب کچھ لوگوں نے اپتھر اور زرد زن لیک دیکھنے کا فیصلہ کیا اگرچہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہیں سے واپس چلنا چاہیئے لیکن اس ٹولی میں ایک امرتسر کا نوجوان لالہ بھی تھا اُس نے کہا کہ جب پیسے خرچ کئے ہیں تو اُن کا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے! اور کھنہ صاحب کو اس کی بات پسند آئی اور کے اپنے دل میں [illegible] بات تھی [illegible] خرچ کر کے اور اس قدر جسمانی تکلیف برداشت کر کے کیا وہ اس چھوٹے سے گھاس کے ٹکڑے پر بیٹھنے کو آئے تھے وادی

کا منظر تو گلمرگ سے بھی دکھائی دیتا تھا۔ اُن کے بچے نے جب سُنا کہ وہ لوگ فروزن لیک دیکھنے کی تیاری کر رہے ہیں تو وہ خوشی سے اچھلنے لگا۔ "پاپا جی! ہم ضرور فرازن لیک دیکھیں گے ــ پاپا جی ہم ضرور فرازن لیک دیکھنے جائیں گے!" اُس نے رٹ لگا دی اور اپنے نئے بنے انکل کا ہاتھ کھینچنے لگا کہ انکل تم بھی چلو اور ہمارا ... انہوں نے وہیں اپنے ساتھیوں کی واپسی کا انتظار کرنے کی سوچی تھی لیکن اُس چھوٹے سے بچے کو تیار ہوتے دیکھ کر وہ بھی تیار ہو گئے۔

کھنہ صاحب کی بیوی نے بیگ ٹھیک کیا اور کھنہ صاحب نے حسن دین کو جا جھنجھوڑا۔

حسن دین نے کمبل ہٹایا۔ اُس کا سر پھٹا جا رہا تھا ــ ناک بہہ رہی تھی اور شاید اُسے حرارت بھی تھی۔ آنکھیں ملتے ہوئے اُس نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔

"صاحب! موسم بہت خراب ہو گیا ہے۔ تم کو بس پکڑنا ہے ــ تم کو اب چلنا چاہیئے"

"نہیں نہیں ــ! اب اتنی دور آئے ہیں تو اپتھر اور فرازن لیک دیکھے بغیر واپس نہ جائیں گے۔ واپسی پر تو برف گاڑیوں سے جائیں گے ــ!"

"صاحب تم دیکھ آؤ۔ ہم نیچے دو نالے پر تمہارا انتظار کریگا!"

گائیڈ کسی بھی آدمی کے ساتھ نہ تھا۔ اس ٹولی میں سے ایک آدمی کبھی بہت دن پہلے لڑکپن میں آیا تھا ــ لیکن ایسی اکیلی جگہ کھنہ صاحب کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔

"نہیں نہیں ــ! تم چلو! اتنی دور آکر تم ہمیں نہیں چھوڑ سکتے ــ"

انہوں نے کہا۔ پھر منت کرنے کے انداز میں بولا۔

"ــ یقین کرو ہم تمہیں خوش کر دیں گے۔ یقین نہیں آئے تو پہلے پیسے لے لو" اور انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"نہیں صاحب ـــ اس کا بات نہیں۔ ہمارا سر درد کرتا ہے ہم کو سردی لگ گیا ہے! بخار لگتا ہے!"

کھنہ صاحب کا بچہ بھاگ آیا اور اس کے حسن دین کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"چلو! ہم کو برف پار کراؤ۔!"

حسن دین نے لمحہ بھر اس شوخ بچے کی طرف دیکھا۔ پھر بے بسی سے بولا:

"بچہ ہمارا طبیعت خراب ہے۔ تم اپنے پاپا ممی کے ساتھ جاؤ!"

بچے نے ہونٹ بھینچ لیے۔ حسن دین کے دل کو کچھ ہوا۔ ہونے سا لگا۔ اپنا سر کا درد اور بخار اسے بھول سا گیا۔

تبھی کھنہ صاحب کی بیوی نے بیگ سے بام نکالی۔ اور اس بار اسے خود حسن دین کے ماتھے۔ کنپٹیوں اور ناک کی کوٹھی کے دونوں طرف مل دیا۔

حسن دین پھر چل پڑا۔

وہ لوگ جہاں کھانا کھانے بیٹھے تھے وہاں سے کچھ ہی قدم اوپر کو بڑھے تو انہیں سامنے برف پھیلی دکھائی دی۔ اسے پار کر کے وہ ایسی جگہ پہنچے جہاں برف کچھ ڈھل گئی تھی ـــ لیکن وہاں چڑھائی کے دوسری طرف کا منظر دکھائی نہ دیتا تھا۔ حسن دین کے پیچھے پیچھے وہ بائیں طرف کو مڑے تو پھر دور تک برف پھیلی دکھائی دی۔ اصل میں یہ اس برف کا بالائی حصہ تھا جو نیچے دو نالے تک چلی گئی تھی چونکہ ڈھلان یہاں نہیں تھی اور ان کے بچے کو برف پر چلنا آ گیا تھا اس لیے وہ اس برف پر بھی اپنے آپ چند قدم بڑھ گیا لیکن کھنہ صاحب نے اسے ڈانٹ دیا کہ حسن دین

کے ساتھ جائے۔

حسن دین نے پھر ایک بار کہا "صاحب! بادل گھر رہا ہے۔ بہتر ہے گا تم کو واپس جانا چاہیئے ۔۔۔!"

لیکن وہاں پہنچ کر اُس پار کا نظارہ نہ کرنا۔ الیٹر اور اُس کی منجھلا چھیل کو نہ دیکھنا اُنہیں اپنے پیسے کا پورے دام وصول نہ کرنا تھا پھر اگر اُن کا بچہ یا بیوی اعتراض کرتے، تھکے دکھائی دیتے تو شاید وہ لوٹ پڑتے لیکن بچہ اُنکا شوخ اور چنچل تھا چلنے یا گرنے کی پرواہ کئے بغیر وہ حسن دین کے ساتھ پچھلی برف پر بھاگتا چلا آ رہا تھا ۔۔ اور اب برف کی یہ ندی پار کرنے کو مستعد تھا۔

"صاحب! پیچھے جانے کا وقت نہیں رہے گا ۔۔۔!" حسن دین نے رُک کر پھر ایک بار کہا۔

کھنہ صاحب نے گھڑی پر نظر ڈالی حسن دین کا ہاتھ کھینچتے ہوئے برف پر قدم بڑھائے، اپنے بچے کی طرف دیکھا اور اُسے دیکھتے ہوئے ماں کی آنکھوں میں جو چمک تھی اس کا خیال کیا اور بولے ۔۔"ہم بیلچوں میں واپس جا رہے تھا تم جلدی کرو ۔۔ ہمارے پاس ایک گھنٹہ ہے۔ اتنی دور آ کر اسپا فر و ڈن لیک دیکھے بغیر واپس نہ لوٹیں گے ۔۔۔ !"

حسن دین بچے کو لئے ہوئے بڑھا۔ کھنہ صاحب کندھے پر کیمرہ اور برساتی سنبھالتے ہوئے اپنی بیوی کو لے کر اُن کے منقش قدم پر پاؤں رکھتے ہوئے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے مڑے ۔ اُن کی بیوی چھاتے سے چھڑی کا کام لیتی رہیں۔

وہ ابھی آدھے راستے میں رہا ہوں گے کہ حسن دین بچے کو چھوڑ کر بھاگا گیا اور دونوں کو سہارا دیتا تیزی سے چلا پچھلی ٹولی کے آدمی گرتے پڑتے پیچھے آ رہے تھے۔

ٹھیک اُس برف کی ندی کے پار، افرابٹ کی چوٹی تھی۔ جہاں سے دوسری طرف کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ کھنہ صاحب وہیں کھڑے رہے۔ منظر ناقابلِ بیان حد تک دلکش تھا۔ اس چوٹی سے سامنے کے پہاڑ کے دائیں بائیں آمنے سامنے۔ ساری جگہ برف سے ڈھکی تھی۔ برف کا وہ پیالہ ایک طرف سے اونچا اور مڑ کی طرف سے جھکا۔ ایک عظیم بیکر (Beaker) دکھائی دیتا تھا ۔۔ دائیں طرف جہاں برف ڈھلوان ہوتی ہوئی افرابٹ کے پیچھے تک چلی گئی تھی، اور سبزی مائل جھلک لیے ہوئے نیلا پانی جھاگ اُڑاتا بہہ رہا تھا۔

اُس کے پرے کہیں اور نیچے دیودار کا جنگل تھا۔ وہیں جنگل کے اوپر آسمان کا رنگ گہرا نیلا ہو گیا تھا اور وہ رہ رہ کر بجلی چمک اٹھتی تھی۔

لیکن حسن دین کو یہ سب خوبصورتی دکھائی نہ دے رہی تھی ۔۔ اُس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اور وہ چاہتا تھا کہ وہ لوگ یہ سب کچھ دیکھ کر نیچے کو چلیں۔ اور وہ اپنے گھر پہنچ کر لحاف اوڑھ لے اور ایک دم سو جائے۔

"صاب ۔۔! پانی آ رہا ہے!" اُس نے جیسے، اپنے لہجہ سے بھی انہیں آگے دھکیلتے ہوئے کہا اور کمبل کو سر سے پیٹتے ہوئے زور سے برف پر ناک صاف کی۔

"پانی تو اب آئے گا ہی ۔۔۔ چاہے ہم آگے جائیں یا پیچھے مڑیں!" کھنہ صاحب بولے "اس لیے ہم مڑیں گے نہیں۔" اور برساتی پہنتے ہوئے انہوں نے نیچے گھاٹی سے نظر اٹھا کر سامنے پہاڑ کے پیچھے سے سر اٹھاتی ہوئی ننگمرگ کی دودھیا برفانی چوٹی کی طرف دیکھا۔ نیلے نیلے آسمان کے سائے تلے وہ بڑی حسین اور دلکش لگ رہی تھی۔

لیکن اُن کے پاس اطمینان سے یہ سب خوبصورتی دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ انہوں نے حسن دین سے پوچھا "کیوں بھئی الپیتھر کہاں ہے ۔۔؟"

حسن دین نے ہاتھ سے سامنے اشارہ کیا۔ "بس یہ سامنے الپتھر ہے۔!"

کھنہ صاحب نے دیکھا فراہٹ کے بائیں طرف برف ہی برف تھی، جسے نیچے سے پار کر کے وہ آئے تھے لیکن دائیں طرف شاید وہ پگھل گئی تھی اور بہت بڑے بڑے لال پتھر بکھرے تھے۔

"فروزن لیک یہاں سے کتنی دور ہے۔؟"

"میل بھر ہو گی صاحب۔۔!"

"نظر کہاں سے آئے گی۔؟"

"الپتھر کے پرے، جہاں یہ چوٹی ختم ہوتی ہے وہاں سے!"

"تو چلو۔۔۔!"

اور وہ چھتری کی مدد سے ادھر کو بڑھے۔ دو جگہ انہیں پھر برف پار کرنا پڑی۔ وہ دوسری بار برف پار کر چھتری کی مدد سے بڑے بڑے پتھروں پر پھلانگتے ہوئے سے جا رہے تھے کہ طوفان نے انہیں آ لیا۔ اور سوکھے امبر سے اولے گرنے لگے۔ دوسرے لوگ نہ جانے کہاں پیچھے رہ گئے تھے۔

ان کی بیوی نے اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ اسی نے چھاتا تان لیا۔ بچے نے لوکدا روہی لمبی پہن لی۔ لیکن وہ بہت بڑھ نہیں پائے۔ کیونکہ اولوں کی ژالہ باری ہونے لگی۔ اور آسمان پر [illegible] کر بادل گرجنے لگے۔

کھنہ صاحب پر جیسے جنون سوار ہو گیا پتھروں پر چھتری ٹکاتے ہوئے وہ لگ بھگ بھاگنے لگے۔ کہ اولے اور بھی زور سے گرنے لگے۔ حسن دین نے قریب آ کر کہا۔ "حضور! اب چلیے۔ یہ سامنے فروزن لیک ہے۔"

کھنہ صاحب نے دیکھا سامنے کی پہاڑی پر برف کچھ ایسے جمی تھی کہ گول دائرہ سا بن گیا تھا لیکن دھیان سے دیکھنے پر انہیں پہاڑ کے دامن میں تین چھپے ہوئے [illegible] دائرہ سمت سے بنے دکھائی

دیئے۔ تینوں طرف برف پوش پہاڑ تھے جن کے درمیان برف کا وہ پیالہ سامنا تھا۔ اس پیالے میں چھوٹے چھوٹے دائرے دکھائی دیتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ یہاں پانی جمع ہوگا۔ کھنہ صاحب رکے نہیں۔۔۔ اپنے بیوی بچے کو وہاں ٹھہرنے کے لئے کہہ کر وہ آگے بڑھے۔

بادل شاید نیچے کھلن مرگ کی طرف اُڑ گیا تھا۔ پتھروں پر پھیلا نگتے، دوا زدو سے بچتے۔ کھنہ صاحب ایک پتھر کے کنارے کی طرف بڑھ گئے۔ آخر وہ اس چوکی کے کنارے پر پہنچ گئے۔ سامنے دوسری چوٹی تک سب جگہ برف جمی تھی۔ اور پتھر کے کافی نیچے ایک جگہ دیری ناگ کے زہر جیسی سبزی مائل نیلے، زہر کبوت رنگ کے پانی کی ایک لکیری دکھائی دے رہی تھی۔

تب تک حسن دین بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔" صاحب! یہ ایک مہینے تک پگھل جائے گا۔ اگست میں تم ادھر آئے گا تو یہاں لیک ملے گا۔ ابھی یہ فروزن ہے۔ جمنا ہے۔ بس، ابھی تو یہاں ذرا سا پانی ہے۔!"

کھنہ صاحب فوراً پیچھے مڑے۔ اپنی بیوی اور بچے کو انہوں نے آواز دی پھر انہوں نے حسن دین کو حکم دیا کہ انہیں جاکر لے آئے۔

حسن دین نے ناک صاف کی۔ کمبل کو سر کے گرد لپیٹا اور جاکر ان کو لے آیا۔

صرف ایک نظر اس پانی پر ڈال کر وہ سب مڑے۔ کھنہ صاحب تیزی میں سب سے آگے چل رہے تھے۔

راستے میں انہیں بزرگ اور ٹولی کے دوسرے آدمی ملے۔ بغیر رکے چلتے چلتے کھنہ صاحب نے انکو راستہ بتایا۔ اور یہ کہتے ہوئے کہ انہیں بس پکڑنی ہے بھاگ گے۔ آتے وقت حسن دین انہیں شارٹ کٹ سے لایا۔ انہیں برف

کا دو دریا پار نہیں کرنا پڑا۔ برف گاڑی والے افریٹ کی آس برفانی ندی کے اس کنارے آ گئے تھے۔ حسن دین شارٹ کٹ سے انہیں اس کنارے سے آیا۔

مطلع صاف ہو گیا تھا۔ اچانک کھنہ صاحب کو خیال آیا کیوں نہ افریٹ کی چوٹی پر پھیلی اس برف پر اپنے بیوی بچے کا فوٹو لیں اور انہوں نے بیگ سے انکا کیمرے کا اسٹینڈ نکال۔ اسے برف میں گاڑا اور کیمرہ فٹ کر کے انہوں نے جلدی جلدی دو فوٹو لئے۔ وہ کیمرہ بند کر رہے تھے کہ انکا بچہ برف گاڑیوں پر چڑھنے کی خوشی میں ادھر کو بھاگا اور پھسل گیا۔ کھنہ صاحب کیمرہ وہیں چھوڑ کر بھاگے حسن دین سے انہوں نے میم صاحب کو لیکر آنے کو کہا اور خود بچے کو اٹھا کر برف گاڑیوں کی طرف بڑھے۔

برف گاڑیاں چھوٹی چھوٹی تھیں ــ بغیر پہیئے کی، اور لگام کی جگہ ان میں رسی لگی تھی۔ ڈرائیور آگے بیٹھے تھے۔ ایک ایک آدمی کو انہوں نے اپنے پیچھے بیٹھنے کو کہا بچہ سب سے آگے رہنا چاہتا تھا۔ اس لئے کھنہ صاحب نے اسے سب سے اگلی گاڑی میں بٹھا دیا۔

" ہماری کمر میں اپنا ہاتھ ڈال کر اسے کس کے پکڑو ــ اور جیسا ہم دونوں پیر کو پھیلاتا ہے ویسا تم پھیلاؤ۔ دیکھو کمر کو نہیں چھوڑنا مت " ڈرائیور نے کہا۔ کھنہ صاحب نے بھی ہدایت دوہرا دی۔ بچہ اس طرح بیٹھ گیا اور برف گاڑی بہہ چلی۔

بچے کے بعد کھنہ صاحب کی بیوی تھیں۔۔

سب سے آخری گاڑی پر وہ خود بیٹھے۔

چلنے سے پہلے انہوں نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ حسن دین نے برساتی نیچے بچھالی تھی، دونوں نے پاؤں پھیلا کر برف میں گاڑ لیئے تھے اور چھڑی کو برف میں گاڑ کر اسٹیرنگ کے لئے دونوں ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ اور وہ کھنہ صاحب کے پیچھے اُترنے کو بالکل تیار تھا۔

اُس کے بعد کھنہ صاحب کی نظر ایستھر کی طرف پڑ گئی۔ برف کے اوپر وہ نما اور جیوانت کھڑے تھے۔ پیچھے صرف نیلا آسمان تھا دونوں کے بال اُڑ رہے تھے اور دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کی کمر میں تھے۔

کھنہ صاحب اور کچھ نہیں دیکھ سکے کیونکہ سلیج چل پڑی تھی۔ صرف حسن دین نے ایک نظر اوشا اور جیوانتر کو دیکھا اور ایک نظر کھنہ صاحب کو اور سر کو ذرا سا جھٹکا دے کر وہ بھی نیچے کو کھسل چلا۔

برف گاڑیاں برقی رفتار سے برف کی ڈھلان پر اُڑی جا رہی تھیں۔ سلیج والے بڑے ماہر ڈرائیور تھے۔ پاؤں برف پر دھنسائے دونوں ہاتھوں سے سلیجوں کی رسیاں پکڑے اُترے جا رہے تھے۔ اُن کے پھیلے ہوئے پیروں کی ایڑیوں سے برف پر دو گہری لکیریں بنتی چلی جا رہی تھیں۔ اچانک کھنہ صاحب کو خیال آیا، کاش کیمرے میں اس منظر کو اُتارا جا سکتا۔ اور کیمرے کا خیال آتے ہی انہوں نے نظر سے آنکھیں اٹھا کر کمر میں ہمیشہ لٹکنے والے کیمرے پر نگاہ ڈالی تو دل دھک سے رہ گیا۔ کیمرہ نہیں تھا۔ تبھی انہیں یاد آیا کہ کیمرہ تو انہوں نے حسن دین سے سنبھالنے کو کہا تھا۔ تب چلا کر انہوں نے اپنے پیچھے آتے حسن دین سے پوچھا۔

"حسن دین کیمرہ اور سٹینڈ تو سنبھال لیا تھا نا ۔ !"

حسن دین نے دیکھا کہ وہ کندھے سے لٹک رہا ہے۔ لیکن فرن کی جیبیں دیکھیں

تو سٹینڈ ندارد۔

"صاب اسٹینڈ تو شاید جلدی میں اوپر رہ گیا"۔ وہ چلّایا۔

کھنہ صاحب نے گاڑی والے کو گاڑی روکنے کو کہا۔ کچھ آگے جاکر گاڑی رک گئی۔

حسن دین کھنہ صاحب کے برابر آگیا۔ اُس نے کیمرہ اُنکے گلے میں ڈال دیا۔

"صاب سٹینڈ شاید اوپر چوٹی پر رہ گیا۔ ہم ابھی اسے لاتا ہے۔ تم چلو — ! ہم شارٹ کٹ سے آتا ہے۔ !"

اور نیچے سے برساتی نکال کر اُسے کندھے پر ڈالتے ہوئے ڈنڈیوں کو برف میں گاڑتا ہوا وہ برف پر سیدھا چوٹی کی طرف چل دیا۔

کھنہ صاحب کا بچہ اور بیوی دور نکل گئے تھے۔ "ہمیں سب پکڑنا ہے۔ بس اب گاڑی کو اُڑاتے چلو۔" انہوں نے سلیج والے سے کہا۔

"صاب ہمارا کمر تو کس کر پکڑ دو اور پیر کو اٹھا کر پیچھے سے ہمارا گود میں رکھو۔" اور اُس نے اُن کے دونوں پیر اٹھا کر گود میں رکھ لئے۔ اور سلیج ہوا سے باتیں کرتا نیچے کی طرف لپکا۔

حسن دین آہستہ آہستہ اوپر چڑھا جا رہا تھا۔ اُن کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے پھر بھی چلا جا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے دھندلا سا چھا رہا تھا۔ اور وہ کبھی فرن کی آستین سے، کبھی کمبل کے کونے سے اپنی ناک صاف کرتا تھا اور بار بار اپنے فرن کی جیبیں ٹٹولتا تھا لیکن چندر کو نے سوچا کسی طرح تو تھا نہیں کہ جیبوں میں گم ہو جاتی۔ سٹینڈ یا تو اوپر رہ گیا تھا یا تیزی سے اترتے وقت گر گیا تھا۔

اُسے اتنا یاد تھا کہ اسٹینڈ لوٹتے وقت وہ کھنہ صاحب کو شارٹ کٹ سے لایا تھا۔ جہاں سلیج والے اپنی چھوٹی چھوٹی سلیجیں لئے کھڑے تھے۔ وہاں اُس بنانی

پسنجروں کو تکلیف دے گی تو پسنجر آئیں گے نہیں اور وہ بھی لوگ بھوکوں مریں گے۔ سٹینڈ تو انہیں خرید کر دینا ہی پڑے گا۔

پنجابی پستک بھنڈار کے مطبوعہ ناول

اُس پار (مضطر ہاشمی) ۵/۲۵
بے بس (جگدیش بھارتی) ۳/۷۵
دولت کے کھیل (خان محبوب طرزی) ۲/۵۰
اندھیرے چراغ (گلشن نندہ) ۴/۵۰
کالی گھٹا " ۳/-
سانجھ کی بیلا " ۳/۷۵
تنہائی " ۵/-
ساحل اور طوفان " ۶/-
ڈوبتی نظریں (کرپا شنکر بھاردواج) ۵/-
بلندیاں (عارف مارہروی) ۳/۵۰
ٹارزن (انور کمال حسینی) ۲/۵۰
ٹارزن کی شادی " ۲/۲۵
" کا بیٹا " ۲/۵۰
" کی گرفتاری " ۲/۵۰
" کا انتقام " ۱/۷۵
" کی فراری " ۲/۵۰
جنگلی ٹارزن " ۳/-

خون کا سایہ (انور کمال حسینی) ۲/-
شیشے کی آنکھ (اکرم الہ آبادی) ۲/۵۰
ادھ کھلا پھول (سوم ناتھ اکیلا) ۲/-
میں بُری نہیں ہوں (گوبند سنگھ) ۱/۷۵
گھر آئے بدردا کارے " ۱/۷۵
ایک سوال (امرتا پریتم) ۲/۵۰
کشمیری شال (جی آر سیٹھی) ۱/۷۵
قاتل کون (اے آر سید) ۱/۷۵
سر کٹے فوجی (عزیز بدایونی) ۲/-
پُراسرار چور (اے آر سید) ۱/۷۵
نقلی جاسوس " ۲/-
سہانی ہوگی رات (ایم عالم) ۱/۵۰
چار بدمعاش (جی آر سیٹھی) ۲/۵۰
خون (شہزادہ تبسم) ۴/-
جاسوس لڑکیاں (مغفور ہوشیارپوری) ۱/۷۵
کالج کے چیلے (کرپا شنکر بھاردواج) ۵/-

ملنے کا پتہ

پنجابی پستک بھنڈار دریبہ کلاں دہلی ۶

ادبی اور فلمی دنیا کے نامور شاعر

جاں نثار اختر

کا

بالکل تازہ مجموعہ

نذرِ بتاں

جسے ساحر لدھیانوی نے ترتیب دی ہے

قیمت دو روپے پچیس نئے پیسے

پنجابی پستک بھنڈار، دریبہ کلاں، دہلی ۶